ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ



پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

# تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ــــــــــ ستمبر ۲۰۰۲ء


مدیر

سیّد جلال الدّین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی



پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

پوسٹ بکس ۹۳

# سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ


جلد ۲۱ شمارہ ۳

ربیع الثانی ـــــــ جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ

جولائی ـــــــ ستمبر ۲۰۰۲ء


## زرِ تعاون

اندرونِ ملک ـــــــ فی شمارہ ۲۵ روپے

ـــــــ سالانہ ۹۰ روپے

ـــــــ لائبریری وادارے سالانہ ۱۲۵ روپے

بیرونِ ملک ـــــــ (انفرادی) ''۴۰۰ روپے

ـــــــ (ادارے) ''۶۰۰ روپے

پاکستان ـــــــ (انفرادی) ''۲۰۰ روپے

ـــــــ (ادارے) ''۳۰۰ روپے


طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے دعوت آفسٹ پرنٹرس دہلی ۔۶ سے چھپوا کر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

# فہرست مضامین

## حرفِ آغاز


قومیں کیوں ہلاک ہوتی ہیں؟ — سید جلال الدین عمری — ۵
(قرآن مجید کا مطالعہ)


## تحقیق وتنقید


مکہ اور مدینہ کے تعلقات — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۲۰
شاہ ولی اللہؒ اور مولانا آزادؒ کی تفسیروں کا تقابلی مطالعہ (۲) — ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی — ۵۶


## بحث ونظر


اسلام کا نظامِ وراثت — مولانا ولی اللہ مجید قاسمی — ۷۵


## ترجمہ وتلخیص


مکہ مکرمہ پر ابرہہ کے حملے کے مقاصد ونتائج ایک تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر ریاض ہاشم نعیمی — ۹۷
ترجمہ: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی


## تعارف وتبصرہ


قرآن اور قانونِ نکاح وطلاق — جناب خورشید حسن رضوی — ۱۱۴

# اس شمارے کے قلمی معاونین

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، ڈاکٹر شاہ ولی اللہ سیل ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

ناظم دینیات (سنی)، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ

۴۔ ڈاکٹر ریاض ہاشم نعیمی

ریڈر سیرتِ نبوی، موصل یونیورسٹی، عراق

۵۔ پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

پروفیسر مرکز دراسات ایشیائے غربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۶۔ جناب خورشید حسن رضوی

۶۰۴۔ بی بلاک، اکبر ٹاورز، ملک پیٹ، حیدرآباد

۷۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

خوش نویس:

ابن سیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## حرفِ آغاز

# قومیں کیوں ہلاک ہوتی ہیں؟

## (قرآن مجید کا مطالعہ)

سیّد جلال الدین عمری

انسان اس بات کا محتاج ہے کہ اس پر زندگی کی صراطِ مستقیم واضح ہو۔ دنیا کی کامیابی اور آخرت کی فوز و فلاح سے پوری طرح باخبر ہو تاکہ محض بے خبری اور ناواقفیت کی وجہ سے اسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اسی لیے آتے ہیں اور دلائل کے ساتھ دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہ اس پر کھول دیتے ہیں۔ جو قوم ان کی ہدایات کو ٹھکرا دیتی ہے وہ راہِ راست سے بھٹک جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ جو قومیں اس طرح تباہ ہوئیں قرآن مجید نے بار بار ان کا تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ ق میں ان میں سے بعض کا ذکر ہے۔

| | |
|---|---|
| كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ | ان سے پہلے قوم نوح، کنویں والے، |
| اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ | قوم ثمود، قوم عاد، فرعون اور لوط کے بھائی |
| وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ | بن کے رہنے والے (قوم شعیب) اور تبع کی قوم |
| وَاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ | جھٹلا چکی ہے۔ ان سب نے رسولوں کی |
| كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ (ق: ۱۲-۱۴) | تکذیب کی پس میری وعید ان پر پوری ہو کر رہی |

یہی بات سورۂ غافر میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ | ان سے پہلے قوم نوح اور اس کے |
| الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ وَهَمَّتْ | بعد کتنے ہی گروہوں نے تکذیب کی اور |
| كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ | ہر امت (کے اشرار) نے اپنے رسول کو |

| | |
|---|---|
| وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا | پکڑنے (اور قتل کرنے) کا ارادہ کیا اور باطل |
| بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَ | کے ذریعہ بحث و تکرار کرنے لگے تاکہ اس |
| فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ | کے ذریعہ حق کو دبا دیں۔ پس میں نے |
| (غافر: ۵) | انھیں پکڑ لیا۔ پھر کیسا تھا میرا عذاب۔ |

جو قومیں اس طرح ہلاک اور تباہ ہوئیں وہ اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ قومیں تھیں، مادی لحاظ سے بامِ عروج پر پہونچی ہوئی تھیں، ان میں سے بعض علم و فن اور صنعت و حرفت میں بڑی نمایاں تھیں، انھیں اپنی تہذیب اور کلچر پر ناز تھا اور وہ خود کو دوسروں سے برتر تصور کرتی تھیں۔ وہ دنیوی معاملات میں بڑی زیرک اور ہوشیار تھیں اور اپنے بھلے برے کا فرق اچھی طرح سمجھتی تھیں، لیکن جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کی، ان کی ہدایات کو ٹھکرایا اور اللہ کی نافرمانی اور معصیت پر جمی رہیں تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں تباہی اور ہلاکت سے نہ بچا سکی۔ ان کا علم، ان کی ہوشیاری اور ان کی شان و شوکت سب کچھ فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ قرآن نے ایک جگہ اس طرح کی قوموں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ | پھر ہم نے ان سب کو ان کے |
| مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ | گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا۔ ان |
| وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ | میں سے بعض وہ تھے جن پر ہم نے کنکر |
| الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ | اور پتھر والی آندھی بھیجی، اُن میں سے |
| خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ | بعض کو ایک ہولناک چیخ نے پکڑ لیا اور |
| مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا | بعض وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا |
| كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ | اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا۔ |
| كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ | اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرے بلکہ |
| (العنکبوت: ۴۰) | وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ |

آیت کا آغاز ہی چونکانے اور آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو بھی پکڑا اس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ اللہ کی گرفت بلاوجہ نہیں ہوتی۔ جب بھی کسی قوم پر اس کا عذاب آتا ہے تو اس کے اعمالِ بد کے نتیجہ میں آتا ہے۔ اس

کے عذاب کی مختلف شکلیں رہی ہیں۔ قومِ عاد پر جو عذاب آیا اس کے اظہار کے لیے یہاں لفظ حاصب آیا ہے۔ 'حاصب' اس آندھی کو کہا جاتا ہے جس میں سنگ ریزے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آندھی صرف مٹی ہی نہیں اڑا رہی تھی، بلکہ اس میں سنگ ریزے بھی شامل تھے۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ اس قوم پر سات رات اور آٹھ دن ایسا سخت طوفان آیا اور اتنی شدید آندھی چلی کہ وہ ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ ہر طرف اس کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کھوکھلے درختوں کی طرح اس آندھی نے اسے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کا کوئی فرد بچ نہ پایا۔ (الحاقۃ: ۷-۸)

قومِ لوط کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پوری بستی تہ و بالا کر کے رکھ دی گئی اور اس پر مسلسل پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ قوم عبرت کا ذریعہ بن کر رہ گئی، اللہ کے عذاب سے ڈرنے والے اس سے درسِ عبرت اور نصیحت حاصل کرتے رہیں گے۔ (ہود: ۸۲-۸۳، الحجر: ۷۴-۷۵، الذاریات: ۳۲-۳۷، القمر: ۳۴-۳۹)

قومِ ثمود ایک بھیانک آواز سے ختم ہو گئی۔ قرآن کا ایک دوسرا بیان ہے کہ اس قوم پر زلزلہ آیا تھا۔ (الاعراف: ۷۸) ہو سکتا ہے کہ اس سے ایسی بھیانک آواز نکلی ہو کہ کلیجے شق ہو گئے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ زمین میں بھونچال آیا ہو اور آسمان سے کسی خوفناک آواز یا بجلی کی زبردست کڑک نے اسے موت کی آغوش میں پہنچا دیا ہو۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیسی آواز تھی جس نے ہمیشہ کے لیے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور اس کا کوئی ایک فرد بھی اپنا حال بتانے کے لیے باقی نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ کے بعض نافرمان بندے وہ بھی تھے کہ زمین شق ہوئی اور وہ اس میں سما گئے۔ ہامان کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کا تعلق حضرت موسیٰ کی قوم سے تھا لیکن اس نے راستہ فرعون کا اختیار کر رکھا تھا۔

حضرت نوحؑ نو سو پچاس (۹۵۰) برس تک اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے رہے لیکن صدیوں کی کوشش کے باوجود ان کی قوم نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس قوم کی اصلاح سے مایوسی کا اظہار کیا اور اس کی تباہی کی دعا کی اور وہ نذرِ طوفان ہو کر رہ گئی۔ سورۂ انبیاء میں چند جملوں میں اس کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝ وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (الانبیاء: ۷۶-۷۷)

(ابراہیم اور لوط سے) قبل نوح نے پکارا تھا۔ ہم نے اس کی پکار سنی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو بڑے کرب سے نجات دی اور ہم نے اس قوم کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کی جس نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی۔ بے شک وہ برے لوگ تھے۔ ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، اس کی ہدایت سے بے نیازی اور حضرت موسیٰ کی تکذیب کا یہ نتیجہ نکلا کہ فرعون اور اس کی پوری قوم غرقِ دریائے نیل ہو گئی۔ ارشاد ہے۔

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝ (الذاریات: ۳۸-۴۰)

اور موسیٰ کے واقعہ میں عبرت ہے جب کہ ہم نے اسے کھلی دلیل کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا۔ اس نے اپنے اعیانِ سلطنت کے ساتھ موڑ لیا اور کہا کہ یہ جادوگر یا مجنون ہے۔ پھر ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور انھیں سمندر میں پھینک دیا اور وہ مستحقِ ملامت تھا۔

سورۂ اعراف میں فرعون اور اس کے لشکر کی تباہی کا ذکر ان الفاظ میں آرہا ہے۔

فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝ (الاعراف: ۱۳۶)

پس ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا۔ اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے بالکل غفلت برتی۔

اس طرح کی بعض اور قوموں کا بھی قرآن نے ذکر کیا ہے۔ قوموں کی اس ہلاکت اور تباہی کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرانے کے بعد افراد کی بھی اور قوموں کی بھی پوری زندگی کا رخ غلط ہو جاتا ہے اور وہ

سیۂ زمین پر بار بن جاتی ہیں۔ ان کے لیے تباہی مقدر ہوجاتی ہے۔ اسے وہ ٹال نہیں سکتیں۔ سوال یہ ہے کہ قومیں تباہی اور بربادی کا رویّہ کیوں اختیار کرتی ہیں؟ اس کے اسباب بھی قرآن نے بیان کیے ہیں۔

## استکبار فی الارض

قوموں کی تباہی کا ایک سبب قرآن کے نزدیک استکبار فی الارض ہے، یعنی اللہ کی زمین میں خودسری کی روش اختیار کرنا اور اپنے مقابلے میں ہر ایک کو ہیچ اور کم تر سمجھنا اور خیرخواہوں کی نصیحت اور خیرخواہی کو حقارت سے ٹھکرا دینا۔ جب کوئی فرد یا قوم اس زعم میں مبتلا ہو جائے کہ وہ سب سے بلند و برتر ہے، وہ عقل کل ہے اور سب نادان اور بے وقوف ہیں اور اپنے علم و فن اور اپنی سیاسی، معاشی اور تمدّنی ترقی پر اترانے لگے تو اپنی تباہی کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ حضرت نوح کی قوم نے جس طرح اپنی دعوت سے بے رخی برتی اور اس کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اختیار کیا اس کے پیچھے یہی استکبار تھا۔ حضرت نوح اللہ تعالیٰ سے بڑے ہی درد کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ | نوح نے کہا، اے میرے رب میں نے |
| قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝ فَلَمْ | اپنی قوم کو شب و روز دعوت دی۔ لیکن |
| یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ | میرے بلانے سے وہ اور زیادہ بھاگتے رہے، |
| وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ | جب کبھی میں نے انھیں دعوت دی کہ |
| جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ | (وہ تیری طرف پلٹیں تاکہ) تو ان کو معاف |
| وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا | کردے تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے |
| وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ | کانوں میں کریں اور اپنے اوپر کپڑے لپیٹ |
| (نوح: ۵-۷) | لیے اور جم گئے اور بڑے تکبر کا مظاہرہ کیا۔ |

قوم عاد و ثمود کی تباہی و بربادی کا ذکر ہے۔ فرمایا قوم عاد کو اپنی قوتِ بازو، فنی مہارت اور تمدنی ترقی پر ناز تھا۔ وہ کسی کو اپنا حریف نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اس میں اپنی توہین تصور کرتی تھی کہ حضرت ہود کی ہدایت اور نصیحت کو مان کر اپنی روش بدل دے

اور اللہ واحد کی عبادت اور بندگی کی راہ اختیار کرلے۔

| | |
|---|---|
| فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي | پس قوم عاد نے زمین میں نخوت کا |
| الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا | ناحق مظاہرہ کیا اور کہا کہ ہم سے زیادہ |
| مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ | طاقت ور کون ہے؟ کیا انھوں نے نہیں |
| يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ | سوچا کہ جس خدا نے انھیں پیدا کیا ہے وہ |
| هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا | ان سے زیادہ قوت کا مالک ہے اور ہماری |
| بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا | آیات کا انکار کر رہے تھے۔ پس ہم نے |
| عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ | ان پر سخت آندھی بھیجی ایسے دنوں میں |
| نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ | جو ان کے لیے منحوس تھے، تاکہ ان کو |
| الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ | دنیا کی زندگی کا عذاب چکھائیں اور آخرت |
| وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ | کا عذاب تو وہ اس سے زیادہ رسوا کن |
| لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ (فصلت: ۱۵-۱۶) | ہے۔ وہاں ان کی کوئی مدد نہ ہوگی۔ |

حضرت صالح نے قوم ثمود کے سامنے اللہ کا دین اس طرح پیش کیا کہ اس کا حق ہونا ثابت ہوگیا اور ان کی غلط روی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں رہ گئی لیکن اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہدایت کی جگہ ضلالت کو ترجیح دی اور روشنی کی جگہ ظلمت کو اختیار کیا۔ بالآخر اس کے فطری نتیجے سے دوچار ہو کر رہی۔

| | |
|---|---|
| وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ | اور ثمود کو ہم نے راہ دکھائی لیکن |
| فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى | انھوں نے ہدایت اور روشنی کے مقابلے |
| الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ | میں اندھے پن کو پسند کیا تو ان کو رسوا کن |
| الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا | عذاب کی کڑک نے پکڑ لیا یہ ان کے |
| يَكْسِبُوْنَ ۝ (فصلت: ۱۷) | اعمال کا نتیجہ تھا جو وہ کر رہے تھے۔ |

حضرت موسیٰؑ نے فرعون، ہامان اور قارون کے سامنے اس بات کے واضح دلائل پیش کیے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اسی کا دین پیش کیا لیکن انھوں نے سرکشی کا مظاہرہ کیا اور اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ایک وقت آیا کہ حضرت موسیٰ کو مصر چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کی قوم اپنے تمام وسائل و ذرائع اور شان و

شوکت کے باوجود اللہ کی گرفت سے نہ بچ سکی۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ | ان کے پاس موسیٰ دلائل لے کر |
| فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا | آیا۔لیکن انھوں نے زمین میں استکبار |
| سٰبِقِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۳۹) | کی روش اختیار کی اور وہ بچ کر نکل نہ سکے۔ |

فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت نے استکبار کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی تعلیمات کو جس غرور کے ساتھ ٹھکرایا اور اس کے نتیجے میں جس طرح تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہوئے اسے قرآن نے ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ | ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون |
| هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ | کو اپنی آیات اور کھلی دلیل دے کر فرعون |
| اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ | اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس |
| فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا | بھیجا لیکن انھوں نے سرکشی کی اور وہ تھے |
| عَالِيْنَ ۝ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ | ہی متکبر لوگ، کہنے لگے کہ کیا ہم اپنے جیسے |
| لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا | دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان |
| عٰبِدُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا | کی قوم ہماری غلام ہے۔ انھوں نے موسیٰ |
| مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝ (المومنون: ۴۵-۴۸) | اور ہارون کی تکذیب کی اور ہلاک ہو کر رہے۔ |

اور بھی بہت سی قوموں نے اسی استکبار کی بنا پر اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولوں کی ہدایت کا انکار کیا اور بالآخر تباہی اور بربادی سے دوچار ہوئیں۔

## فساد فی الارض

قوموں کے بگاڑ اور ان کی تباہی کا ایک سبب فساد فی الارض رہا ہے۔ جب کسی فرد یا قوم میں فساد آتا ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا وجود نقصان دہ ثابت ہونے لگتا ہے۔ فساد کی ضد صلاح ہے۔ کسی چیز کی افادیت کا باقی رہنا اور دوسروں کے لیے اس کا کارآمد اور مفید ہونا صلاح ہے۔ جو قومیں تباہ ہوئیں قرآن نے ان کا ایک جرم یہ بیان کیا ہے کہ وہ زمین میں فساد پھیلا رہی تھی۔ ان کے ذریعہ دنیا کو فائدے اور نفع کی جگہ ضرر اور نقصان پہنچ رہا تھا، انھوں نے قتل و خوں ریزی

نسل کشی، کھیتوں اور باغوں کی تباہی، مواشیات کی بربادی، تعلقات کی خرابی، حقوق کی پامالی، کاروبار میں جھوٹ، دھوکہ، فریب جیسی روش اختیار کر رکھی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی دعوت اسی فساد کے خلاف ہوتی تھی۔ وہ پورے زور اور قوت کے ساتھ کہتے تھے کہ زمین میں فساد نہ مچایا جائے۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ | زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ |
| بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا | مچاؤ اور خوف اور توقع سے اسے پکارو، |
| وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ | بے شک اللہ کی رحمت محسنین سے |
| مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (الاعراف: ۵۶) | قریب ہے۔ |

اللہ تعالیٰ نے زمین میں اصلاً امن وسکون اور صلاح وفلاح رکھی ہے۔ اس کا پورا نظام اسی مقصد کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اس کے پیغمبروں کی بعثت اسی کے لیے ہوتی ہے۔ فساد اس کی اس اصل حالت کو بدلنے کا نام ہے۔ جب زمین میں فساد پھیلتا ہے تو اس کے ساتھ خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ "زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اس کی اصلاح کے بعد" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور اپنی ہدایات کے ذریعہ زمین کی اصلاح کر دی ہے، تم اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو۔[1]

فساد اور اصلاح کا تصور بہت وسیع ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسی کہتے ہیں۔

"یہاں زمین میں ہر قسم کا فساد برپا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس میں جان، مال، نسب عقول وادیان ہر چیز کا فساد شامل ہے 'بعد اصلاحہا' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے زمین کو مخلوق کے منافع اور بندوں کے مصالح کے مطابق بنایا ہے۔ اس میں بگاڑ نہ پیدا کیا جائے۔ اصلاح اور فساد کے تعیین کے ذیل میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں، انھیں بطور مثال سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کسی ایک شکل کی تعیین کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ مفسرین نے جو کچھ کہا ہے علامہ ابوحیان اس سب کو اس میں شامل سمجھتے ہیں جیسے عدل وانصاف

---

[1] قاضی بیضاوی فرماتے ہیں بعد اصلاحہا ببعث الانبیاء وشرع الأحکام (انوار التنزیل: ۱/۳۴۲ دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان ۱۹۸۸) اس کے بعد آیت ۸۶ کے ذیل میں لکھتے ہیں بعد اصلاحہا ای بعد ما اصلح امرہا أو اھلہا الانبیاء و اتباعہم بالشرائع (بیضاوی: ۱/۳۴۹)

کے بعد ظلم، ایمان کے بعد کفر، اطاعت کے بعد معصیت، معصیت کا ارتکاب جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ بارش روک دیتا ہے اور قحط آجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت کے ذریعہ کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتا ہے۔ فساد یہ ہے کہ ان کو برباد کر دیا جائے، درختوں اور پھلوں کو اجاڑ دینا، اللہ کے رسولوں کی تکذیب، شریعت اور احکام شریعت کے آنے کے بعد اس کی مخالفت، سب اس میں شامل ہے"[1]

حضرت شعیب اپنی قوم کو دعوتِ اصلاح کے ساتھ فساد سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور مفسدین کے انجام سے آگاہ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ | اور مدین کی طرف ان کے بھائی |
| قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ | شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری |
| مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ | قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اس |
| بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا | کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے تمہارے |
| الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا | پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل |
| النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا | آچکی ہے پس تم ناپ اور تول کو پورا کرو |
| تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ | اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو، زمین |
| اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ | میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، یہ |
| لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ | تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے |
| وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ | ہو اور راستوں پر مت بیٹھو دھمکیاں دیتے ہوئے |
| وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ | اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں انہیں اس کے |
| اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ | راستے سے روکتے ہوئے اور ٹیڑھی راہ کی |
| وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۗ | تلاش میں۔ یاد کرو کہ جب تم تھوڑے تھے |
| وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ | تو اللہ نے تمہاری تعداد بڑھائی اور دیکھو |
| الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (الاعراف: ۸۵-۸۶) | مفسدین کا کیا انجام ہوا۔ |

فرعون نے بنو اسرائیل کے ساتھ جو ظالمانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور جس طرح وہ ان کی نسل کشی کر رہا تھا وہ فساد کی بڑی بھیانک شکل تھی۔

---

[1] ابوحیان۔ البحر المحیط ۴/۳۱۳ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۳ء

| | |
|---|---|
| اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ | بے شک فرعون نے زمین (مصر) میں |
| وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ | سرکشی کی تھی اور اس کے باشندوں کو |
| طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ | گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کے ایک |
| اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ | گروہ کو کمزور کر رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو |
| اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ | ذبح کر دیتا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ |
| (القصص : ۴) | بے شک وہ مفسدین میں سے تھا۔ |

حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اللہ کا دین دلائل کے ساتھ پیش کیا اور اصلاحِ حال کی دعوت دی، لیکن ان مفسدین نے اسے رد کر دیا۔ قرآن مجید نے ایک جگہ ان کے انجام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ | پھر ہم نے ان (سابقہ انبیاء) کے بعد |
| مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ | موسیٰ کو اپنی آیات دے کر فرعون اور |
| وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا | اس کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ انھوں |
| فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ | نے ان آیات کے ساتھ ظلم کیا۔ پس دیکھو |
| الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (الاعراف : ۱۰۳) | کہ ان مفسدین کا کیا انجام ہوا۔ |

یہ مثالیں اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ جب کوئی قوم صلاح کی جگہ فساد کی راہ پر چل پڑتی ہے اور تذکیر و تنبیہ کے باوجود اپنی روش نہیں بدلتی تو وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو جاتی ہے۔

## ظلم و عدوان

ظلم و عدوان فساد ہی کی ایک شکل ہے جس قوم نے بھی عدل و انصاف کو چھوڑ کر ظلم کی راہ اختیار کی وہ بالآخر تباہ ہو کر رہی۔ ظلم و عدوان کے کئی پہلو ہیں۔ قرآن مجید میں شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی، اس کی ہدایت سے بے نیازی، معصیت کا ارتکاب، انسانوں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی اور غیر انسانی رویہ اختیار کرنا، یہ سب ظلم کی مختلف شکلیں ہیں۔ ظلم کسی چیز کے غلط استعمال کو کہا جاتا ہے۔ جب انسان اپنی فہم و فراست اور صلاحیتوں

کا غلط استعمال کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر اور دوسروں پر ظلم کرتا ہے یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ جو قومیں اپنی قوت وصلاحیت کو غلط طریقے سے استعمال کرتی ہیں وہ اپنے ساتھ بھی ظلم کرتی ہیں اور دوسروں پر بھی ظلم وستم ڈھاتی ہیں۔ ہوسکتا ہے چند دن ان کی شان وشوکت اور حکومت وطاقت کے ڈنکے بجتے رہیں، لیکن بہت جلد تباہی ان کی مقدر ہو جاتی ہے۔ جو قومیں تباہ ہوئیں قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ انھوں نے ظلم کا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ | ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں |
| مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا | کو ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کیا، |
| وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ | ان کے پاس ان کے رسول دلائل کے |
| وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ | ساتھ آئے۔ وہ ایمان لانے والے نہ تھے |
| نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ | (ایمان نہ لائے اور اپنے انجام سے دوچار |
| (یونس: ۱۳) | ہوئے) اسی طرح ہم مجرمین کو سزا دیتے ہیں۔ |

ایک اور جگہ فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا | جن لوگوں نے ظلم کیا وہ جس عیش میں تھے |
| مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا | اسی کے پیچھے پڑے رہے اور وہ مجرم اور |
| مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ | خطاکار تھے۔ تمہارا رب بستیوں کو ناحق |
| لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا | ہرگز ہلاک نہیں کرتا جب کہ وہاں کے لوگ |
| مُصْلِحُوْنَ ۝ (ہود: ۱۱۶-۱۱۷) | نیک اور صالح ہوں۔ |

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ | تیرا رب بستیوں کو ہرگز ہلاک نہیں |

---

لہ ان آیات کے ذیل میں قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:۔

"واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیه" ما انعموا فیه من الشهوات واهتموا بتحصیل اسبابها واعرضوا عما وراء ذلك" وكانوا مجرمین" كافرین كأنه اراد أن یبین ما كان السبب لاستئصال الأمم السالفة وهو فشو الظلم فیهم واتباعهم للهوی وترك النهی عن المنكرات مع الكفر (بیضاوی: ۱/۴۳۱)

| | |
|---|---|
| الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ | کرتا جب تک کہ ان کی بڑی بستی میں رسول |
| اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ | نہ بھیج دے جو انھیں ہماری آیتیں سنائے |
| اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى | اور ہم بستیوں کو ہرگز ہلاک نہیں کرتے مگر |
| اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ | اس وقت جب کہ اس کے باشندے |
| (قصص: ۵۹) | ظلم کر رہے ہوں۔ |

## ارتکابِ سیّات

اگر کوئی قوم دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور اپنے وسائلِ حیات کو عیش و عشرت میں لگا دے، فسق و فجور کی راہ پر چل پڑے، اللہ کی ہدایت اور رہنمائی کا انکار کر دے، اس کے رسول کی تکذیب اور اس کے خلاف سازشیں اور خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اس کے اور اس کے ساتھیوں کے درپے آزار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے لگتی ہے۔ قرآن مجید نے ارتکابِ سیّات کے نتیجے سے بار بار آگاہ کیا ہے۔ فرمایا:

| | |
|---|---|
| اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ | کیا ان لوگوں نے جو برائیوں کا ارتکاب |
| السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ | کرتے ہیں، سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بازی لے |
| مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۴) | جائیں گے۔ برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ |

برائیوں کے ارتکاب سے مراد فکری گمراہی اور عملی بگاڑ دونوں ہی ہیں۔ اللہ کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کے بعد کسی کا یہ سوچنا کہ وہ اس کی پکڑ سے بچ جائے گا، بہت بڑی نادانی ہے۔ سورۂ نحل میں زیادہ سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے:

| | |
|---|---|
| اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ | کیا وہ لوگ جو برائیوں کا ارتکاب کرتے |
| اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ | ہیں وہ اس سے بے خوف ہو گئے کہ اللہ |
| اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ | ان کو زمین میں دھنسا دے یا ان پر اس |
| لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ | طرف سے عذاب آجائے کہ اسے وہ محسوس |
| تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ | نہ کریں، یا انھیں (ان کے سفروں میں) چلتے |
| اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰي تَخَوُّفٍ ۭ | پھرتے پکڑ لے اور وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے |

فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (النحل: ۴۵-۴۷)

یا انہیں آہستہ آہستہ کم کرکے پکڑ لے۔ بے شک تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

جو قومیں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وسائلِ حیات کو اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ سمجھتی ہیں اور جن کی زندگی آلودۂ سیئات ہو جاتی ہے ان کی دنیا و آخرت تباہ ہو کر رہتی ہے تنگ دستی اور خوش حالی میں غلط کار افراد اور اقوام کی نفسیات اور اس کے عبرت ناک انجام کا چند جملوں میں ذکر ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ (الزمر: ۴۹-۵۱)

جب آدمی کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اپنی جانب سے راحت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے اپنے علم (اور صلاحیت) کی وجہ سے ملا ہے بلکہ یہ فتنہ اور آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں سمجھتے، یہ بات ان سے پہلے بھی لوگوں نے کہی تھی، لیکن جو کچھ وہ کسب کر رہے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آیا۔ انھوں نے جو برائیاں کمائی تھیں ان کا بدلہ انھیں مل کر رہا۔ ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا ہے انھیں بھی ان کی برائیوں کا بدلہ ملے گا اور وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے۔

قرآن مجید نے قوموں کی ہلاکت اور تباہی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان میں سے بعض کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ کسی قوم کی محض مادی ترقی، معاشی خوش حالی اور عسکری طاقت اس کے دوام و بقا کی ضمانت نہیں ہے۔ کوئی قوم مادی لحاظ سے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے، صنعت و حرفت میں وہ معاصر اقوام سے کتنی ہی آگے کیوں نہ ہو، اس کی تہذیب اور کلچر کتنا ہی جاذب اور پرکشش کیوں نہ دکھائی دے رہا ہو اور اسے اغیار پر کتنی ہی بالادستی کیوں نہ حاصل ہو، اگر اس کے اندر عقیدے اور فکر کا بگاڑ اور اخلاق

زوال موجود ہے تو اس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھے گا اور اسے اس کا احساس اس وقت ہوگا جب کہ اللہ کے عذاب کے تازیانے برسنے لگیں گے۔

اس وقت دنیا میں جن قوموں کو سیاسی، تہذیبی اور معاشی برتری اور غلبہ حاصل ہے، جو کم زور اور ترقی پذیر ممالک کے معاملات میں پوری طرح دخیل اور ان کے در و بست کو مختلف طریقوں سے کنٹرول کر رہی ہیں اور جو جس فرد یا طبقہ کو چاہتی ہیں تختِ حکومت پر بٹھاتی اور جسے چاہتی ہیں تاجِ اقتدار سے محروم کر دیتی ہیں، افسوس کہ انھوں نے وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے جو تباہ شدہ قوموں کا راستہ رہا ہے۔ یہ قومیں نشۂ اقتدار میں اس حقیقت کو فراموش کر چکی ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق و مالک ہے۔ اس کی طاقت بے پناہ اور اس اقتدار لازوال ہے، اس کی قوتِ قاہرہ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ بغاوت اور سرکشی، ظلم و زیادتی اور استکبار کو برداشت نہیں کرتا۔ معصیت جب حد سے آگے بڑھتی ہے تو اس کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ انسان ہر حال میں اس کی ہدایت اور راہنمائی کا محتاج ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر فلاح و کامرانی کی تلاش سراب کی تلاش ہے۔

ان ترقی یافتہ، یا حکم راں قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے، جو ان کی ذہنی غلامی سے آزاد ہیں، جو ان کے غلط طرزِ فکر اور ناروا اقدامات کی تائید نہیں کرتے، جو انہیں اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی معصیت اور نافرمانی کے انجام سے باخبر کرنا چاہتے ہیں، انہیں وہ اپنا حریف اور دشمن سمجھنے لگتی ہیں اور انہیں ختم کرنے کے لیے ہر ناجائز تدبیر کو جائز قرار دیتی ہیں۔ کیا یہ کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے؟

## کچھ تحقیقاتِ اسلامی کے بارے میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کی عمر کا اکیسواں سال چل رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے علمی دنیا میں اپنا ایک وقار اور اعتبار قائم کیا ہے۔ کوشش رہی ہے کہ اس کے معیار کو یہی نہیں کہ باقی رکھا جائے بلکہ اسے جہاں تک ہو سکے بہتر بنایا جائے۔ اس نے مختلف موضوعات پر خاصا ٹھوس مواد فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ تلاش و تحقیق کے بہت سے گوشے ہیں جو اس میں زیرِ بحث نہیں آسکے ہیں۔ اگر آئے بھی ہیں تو ابھی تشنہ ہیں اور مزید توجہ چاہتے ہیں۔ اصحابِ علم اور تحقیقاتِ اسلامی کے قلمی معاونین سے

ہماری درخواست ہے کہ وہ اس مجلہ کو اپنا مجلہ سمجھیں، (فی الواقع یہ ان ہی کا مجلہ ہے) اور اپنی علمی کاوشوں اور تحقیقی نگارشات سے اس کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں ہمارا تعاون فرمائیں۔

'تحقیقاتِ اسلامی' جیسے علمی مجلات کے لیے مالیات کا مسئلہ ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ سہ ماہی ہونے کی وجہ سے اسے ڈاک کی سہولتیں بھی حاصل نہیں ہیں۔ گرانی میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات میں یہ پہلے سے زیادہ اصحابِ خیر کی ہمدردی اور توجہ چاہتا ہے۔ دو چار اصحابِ خیر چاہیں تو اسے مالیات کی فکر سے آزاد کر سکتے ہیں۔ تعاون کی شکلیں وہ خود ہی تجویز فرما سکتے ہیں۔ اس سے اللہ نے چاہا تو اس کے کارکن زیادہ یکسوئی سے کام کر سکیں گے۔

---

پانچ چھ سال سے میرا قیام مرکز جماعت اسلامی دہلی میں ہے۔ میں اپنی مختلف علمی اور دعوتی مصروفیات کی وجہ سے تحقیقاتِ اسلامی کے لیے اتنا وقت نہیں دے پاتا، جتنا قیام علی گڑھ کے زمانہ میں دیا کرتا تھا۔ تحقیقاتِ اسلامی ہمیشہ وقت پر شائع ہوتا رہا ہے، لیکن ادھر اس کی اشاعت میں کافی تاخیر ہونے لگی ہے چنانچہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء کا شمارہ نومبر میں پریس میں جا رہا ہے۔ تحقیقاتِ اسلامی کے کاموں میں برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا عرصہ سے تعاون حاصل رہا ہے۔ اب ادارہ کی میٹنگ میں میری درخواست پر انھیں باضابطہ معاون مدیر مقرر کیا گیا ہے۔ رضی الاسلام صاحب ایک سنجیدہ، باصلاحیت اور وسیع المطالعہ صاحبِ علم ہیں۔ ان کی کئی تصنیفات اور تراجم شائع ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتِ اسلامی میں پابندی سے دیکھتے رہے ہیں۔ ان کے تعاون سے امید ہے تحقیقاتِ اسلامی کو مزید ترقی اور استحکام حاصل ہوگا۔ راقم سے مرکز جماعت اسلامی کے پتہ پر اور ڈاکٹر رضی الاسلام صاحب سے ادارۂ تحقیق کے پتہ پر مراسلت ہو سکتی ہے۔

---

## تحقیق وتنقید

# مکہ اور مدینہ کے تعلقات

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

### پس منظر

حرمین شریفین کے معاشرتی تعلقات بہت قدیم رہے ہیں۔ شاید اس وقت سے جب مکہ بکہ کہلاتا تھا اور مدینہ یثرب۔ دونوں شہر عرب قبیلوں کی آماجگاہ رہے ہیں۔ مکہ بنو عدنان کے شمالی طبقہ عرب کا مسکن رہا ہے اور مدینہ بنو قحطان کا۔ ان دونوں میں قبائلی فرق وامتیاز بعد کا ہے۔ اصل ان دونوں کی ایک ہے۔ اس کا ان دونوں کو احساس اور شعور تھا۔ اسی بنا پر ان کے درمیان عرب ہم آہنگی تھی[1]

مکہ اور مدینہ کے درمیان تہذیبی یک جہتی نے ان کے قبائلی اختلاف کو کافی حد تک محدود کر دیا تھا اور یہ قبائلِ عرب کی حسّاسیت وشعور کی علامت تھی۔ طبقاتی تقسیم یا اور کسی قسم کی تفریق کے باوجود ان کے احساسِ عربیت نے ان کو ایک دوسرے سے مضبوطی اور محبت کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس شعور نے کہ وہ عرب ہیں اور بحیثیت عرب ایک گروہ ہیں ان کو ایک قوم، ایک امت اور ایک ہم آہنگ جماعت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ عربی زبان، ایک متحدہ تہذیب سے وابستگی، دینِ ابراہیمی سے شیفتگی اور عربی اجتماعیت نے اہلِ مکہ اور اہلِ یثرب

---

[1] ابن ہشام ۱/۴-۵ .... وبعض اہل العلم یقول: قحطان من ولد اسمٰعیل، ویقول: اسمٰعیل ابو العرب کلہا....) سہیلی ۲/۲۲-۲۶ ومابعد؛ بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب قریش؛ فتح الباری ۶/۶۵۲-۶۵۹، ۶۶۷ ومابعد؛ ازرقی، کتاب اخبار مکۃ، فاکہی، المنتقی فی اخبار ام القریٰ؛ سمہودی وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ؛ نیز کتبِ حدیث وسیرت وتاریخ کے متعلقہ ابواب

دونوں کو ایک رشتۂ صحبت میں باندھ رکھا تھا[1]

جغرافیائی نسبت و ربط نے ان دونوں شہروں اور ان کے باشندوں میں ایک نیا رشتۂ مودت استوار کر دیا تھا۔ مکہ سے تین سو میل، لگ بھگ پانچ سو کلومیٹر کی مسافت میں بجانبِ شمال مدینہ واقع تھا۔ ان دونوں کی اصل جغرافیائی یک جہتی یہ تھی کہ دونوں شام کو جانے والے اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھے جو شمال میں شام کو جنوب کے یمن سے جوڑتی تھی۔ مکہ شروع سے بے آب و گیاہ وادی کا شہر تھا اور اس کی اقتصادی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا اور اس تجارت میں ریڑھ کی ہڈی ان کی شامی تجارت تھی۔ اہلِ مکہ اور قریش بکہ شام آتے جاتے لازمی طور سے یثرب سے گذرتے تھے اور وہاں قیام کرتے تھے[2]

مکہ مکرمہ بیت اللہ کے شرف سے بھی مشرّف و مفتخر تھا۔ حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر خانۂ کعبہ کے بعد سے وہ تمام اہلِ عرب اور دوسرے لوگوں کا مرجع و ماویٰ بن گیا تھا۔ دنیا جہان کے لوگ اللہ کے مقدس گھر کی زیارت، عمرہ اور حج کرنے کے لیے مسلسل مکہ مکرمہ آتے رہتے تھے۔ ان کی آمد و رفت میں وقت اور زمانہ کی کوئی پابندی نہ تھی چار مقدس مہینوں کے علاوہ عربوں نے آٹھ محفوظ مہینوں کی روایت اسی زیارتِ کعبہ کی خاطر ڈالی تھی[3] پھر حرمِ مکہ قدیم زمانے سے شہرِ امان، بلدِ امین اور علاقۂ محفوظ تھا جہاں دوست دشمن سب کی جان و مال و آبرو محفوظ تھی، شمال سے آنے والے متواتر قافلے اور پیہم کاروان مدینہ منورہ سے ہو کر ہی گذرتے تھے،

---

[1] ابن ہشام ۱/۴-۵، ۳۴-۳۵، ۶۵-۶۶ و مابعد؛ ۸۱-۸۳؛ یاقوت حموی، معجم البلدان: مکہ والمدینۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، باب ما کان علیہ حال اہل الجاہلیۃ الخ، ۱/ ۱۲۴-۱۲۸؛

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ "مدینہ"؛ مقالہ "مکہ" اور "یثرب"؛ معجم البلدان، مکہ والمدینۃ؛ حوالہ جات سابقہ؛ بلاذری ۱/ ۲۵۷: فقال (علیہ وسلم) قد اخبرت ان دار ہجرتکم یثوب، فمن اراد الخروج فلیخرج فان البلاد قریبۃ وانتم عارفون وہی طریق عیرکم الی الشام؛ .....

[3] قرآن، سورہ توبہ ۳۶: "منہا اربعۃ حرم"؛ ابن ہشام ۱/ ۱۱۴: والبصل..... ثمانیۃ اشہر حرم لہم من کل سنۃ من بین العرب، قد عرفت ذلک لہم العرب

بلکہ وہ ان کی ایک اہم ترین منزل تھی، مدینہ سے وہ مکہ آتے تو کھجوروں کی سوغات اور دوسری مادی اشیاء کے تحفے کے ساتھ انسانی محبت وتعلق کے رشتے بھی لاتے۔ خود اہلِ یثرب مکہ مکرمہ کی حاضری کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ کعبۃ اللہ ان کے لیے بھی سب سے عظیم شعار اور جلیل ترین سجدہ گاہ تھی۔[1]

انسانی زندگی کی پیچیدہ رشتہ داری اور تہذیبِ عربی کی گوناگوں وابستگی نے قبائلی حرب وضرب اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بہت سی سماجی، دینی اور تہذیبی خرابیوں کو محصور کر رکھا اور ان کو کبھی بھی عربیت کے احساس وشعور اور قومیت کی یک جہتی اور ہم آہنگی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کی اپنی فطری شریت نے ان کو قبائلی تفریق کا شکار بنایا، اس نے خاندانی عصبیتوں اور افرادی رقابتوں کو جنم دیا، ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان کے دشمنوں نے بالخصوص یہودی سائیکی نے ان کو باہم ایک دوسرے کا مقابل، حریف، رقیب اور دشمن بنائے رکھا لیکن ان کے اندرون سے یہ احساس اور جذبہ نہ مٹا سکا کہ وہ ایک عرب قوم اور ایک ملک کے باشندے ہیں۔ وہ تمام جنگ وجدال کے باوجود عرب برادر تھے اور اسی حسّاسیت نے ان کو ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط وآمیخت رکھا۔ اہلِ مکہ اور ساکنانِ یثرب کے درمیان عرب ہونے کے احساس اور قومی شعور نے قریبی تعلقات استوار کیے تھے۔[2]

## تاریخِ تعلقات: قدیم جاہلی دور

مکہ ویثرب کے باشندوں کے تعلقات کا نقطۂ آغاز حج کے قیام و ادائیگی کے لیے اذانِ ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں اہلِ یثرب کی لبیک کی صدا ہے۔ یہ ایک بنیادی اور مسلّمہ حقیقت ہے مگر تاریخِ عرب اس کا ساتھ نہیں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مضمونؒ مکہ مکرمہ۔ البلد الامین کی حیثیت سے"، مصادر مذکورہ بالا نیز مندرجہ ذیل؛

[2] ابن ہشام ۲/۳۸ وما بعد .... انا قد ترکنا قومنا ولا قوم بینہم من العداوۃ والشر ما بینہم، وعسی ان یجمعہم اللہ بک۔

دیتی[1] اور اتنی قدیم تاریخ کا کھوج لگانا کسی بھی لحاظ سے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ تحقیقی جستجو کے لحاظ سے سود مند ہو مگر سیرتِ نبوی کے پس منظر میں اور تاریخِ اسلام کے مطالعہ کے لیے بعثتِ محمدی سے قبل کی دو تین صدیوں سے بحث کرنا کافی ہے۔

شہر مکہ کے اصل بانی اور قبائلِ قریش کے حقیقی جامع قصی بن کلاب تھے۔ ان سے پہلے قریش بالعموم بنو النضر کہلاتے تھے۔ حالانکہ نضر بن کنانہ کو اولین قریش کہا گیا ہے اور اولین جامع قبائلِ قریش، مگر اس دور میں قریشی لوگ سرزمینِ مکہ میں منتشر تھے، وہ ادھر ادھر سکونت رکھنے کے علاوہ معاشرتی پراگندگی کا شکار رہے اور ابطح۔ داخل مکہ۔ میں تو کوئی مقیم نہ تھا۔ ان کے بھتیجے فہر بن مالک بن کنانہ بھی قریش کے لقب سے موسوم ہوئے، مگر ان کی جمعیتِ قریش بھی اسی طرح پراگندہ رہی۔ مکہ مکرمہ اور قریش کی اصل تعمیر و ترتیب قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ کی مرہونِ منت ہے[2]

قصی (اصل نام زید) بن کلاب اپنے والد کے انتقال کے بعد شامی سرحد کے قریب آباد قبیلۂ قضاعہ کے سردار ربیعہ بن حرام عذری کے گھر میں ارضِ شام میں پلے بڑھے اور جوان ہو کر حجاج کے قافلے میں یثرب سے گذرتے ہوئے مکہ پہنچے اور صلاحیت و لیاقت سے مکہ مکرمہ کے سب سے عظیم سردار، شہر مکہ کے بانی اور قریش کو متحد کرنے والے کبیر قوم بن گئے۔ بعد میں ان کے دو فرزندانِ گرامی عبد الدار اور عبد مناف نے مکہ مکرمہ کی سیادت و سیاست کی زمام کار سنبھال لی۔ انہی عبد مناف بن قصی قریشی اور ان کے فرزندِ عظیم ہاشم بن عبد مناف قریشی نے

---

[1] سورہ حج: ۲۷؛ ابن ہشام ۱/۲-۳ ومابعد؛ کے علاوہ بلاذری، ابن سعد، طبری وغیرہ کتب و تاریخ کے اولین ابواب۔

[2] ابن ہشام ۱/۱۱۶-۱۱۸؛ سہیلی ۲/۲۸-۵۵ ومابعد؛ ابن سعد ۱/۶۶-۷۴ ومابعد؛ طبری ۲/۲۵۴-۲۶۶؛ بلاذری ۱/۴۷-۵۲ ومابعد؛ مصنون "عبد الملک ہاشمی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا؛ قریش مکہ کی شامی تجارت پر یعقوبی ۲/۷-۸ کے مطابق قصی کی جلالتِ شان کی بنا پر قریش سنین کی تاریخ ان کی موت سے کرتے تھے تاآنکہ واقعہ فیل کی شہرتِ عام کے سبب اس سے تاریخ سنین ہونے لگی اور بعد میں مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔

یثرب سے اور قریبی روابط اور تاریخی تعلقات کا باب کھولا۔[1]

## خاندانِ بنو عبد مناف اور مدینہ

ہاشم بن عبد مناف قریشی مکہ مکرمہ کے عظیم سردار ہونے کے علاوہ بین الاقوامی تجارتِ عرب سے بھی وابستہ تھے۔ وہ مکہ مکرمہ سے براہِ مدینہ منورہ شام آیا جایا کرتے تھے۔ اپنے ایک سفر کے دوران ہاشم بن عبد مناف قریشی نے مدینہ منورہ کے عظیم ترین عرب قبیلہ خزرج کے ایک ممتاز ترین خاندان بنو النجار کے گھرانے بنو عدی بن النجار کی ایک ممتاز و حسین خاتون سے شادی کی۔ ان کا اسم گرامی سلمیٰ بنتِ عمرو بن زید نجاری خزرجی تھا۔ خاتونِ نجاری کی ماں اور نانی وغیرہ نجاری، خزرجی اور مدنی تھیں۔[2] یہ مشہور ترین روایت ہے۔ لیکن ہاشم بن عبد مناف کے ازدواجی تعلقات اس سے قبل بھی مدینہ کے خزرج سے استوار ہو چکے تھے۔ اس کا ذکر آتا ہے۔ بلاذری کی روایت میں زیادہ تفصیل ہے جو قریش اور بنو عدی بن نجار/خزرج اور مکہ و مدینہ کے تعلقات کو اور قدیم بناتی ہے۔ اس کے مطابق ہاشم بن عبد مناف شام کو تجارت کے لیے جاتے تو یثرب سے گذرتے اور وہاں عمرو بن زید بن لبید خزرجی کے گھر اترتے۔ کیوں کہ عمرو خزرجی ان کے ہی نہیں ان کے والد عبد مناف کے دوست تھے۔ وہ اپنی شامی تجارت گاہ سے واپسی پر اپنے متعدد اسفار میں سے ایک سفر میں ان کے مہمان ہوئے تو ان کی دختر سلمیٰ بنت عمرو خزرجی پسند آگئیں اور ان سے شادی کر لی۔ اس شادی کی ایک شرط یہ تھی کہ ان سے جب بھی اولاد ہوگی تو اس کی ولادت بیوی کے

---

[1] طبری ۲/۲۵۱-۲۵۴ و ما قبل؛ بلاذری ۱/۶۴؛ ابن سعد ۱/۷۴-۸۲، ——— بلاذری کے مطابق بنو نجار/خزرج کے شیخ عمرو بن زید مدینہ/یثرب کے سردار اور عبد مناف کے دوست تھے۔

[2] ابن ہشام ۱/۱۱۹؛ سہیلی ۲/۶۵-۶۶ و مابعد؛ طبری ۲/۲۴۸؛ بلاذری ۱/۶۴؛ ابن سعد ۱/۸۱-۸۲۔

گھر والوں میں ہی ہوگی۔ ہاشم ان کو مکہ لائے لیکن جب اولاد پیدا ہونے کا وقت آیا تو ان کو یثرب پہونچا کر برائے تجارت شام چلے گئے، وہاں ان کی ارض فلسطین کے شہر غزہ میں وفات ہوگئی۔ ادھر مدینہ/یثرب میں سلمیٰ خزرجی نے ہاشم کے فرزند شیبہ کو جنم دیا۔ یہ فرزندِ ہاشم کا مشہور اور روایتی نام ہے جو مصادرِ سیرت میں پایا جاتا ہے۔ اصلاً وہ لقب ہے اور ان کا اصل نام کچھ اور تھا۔ شیبہ یا شیبۃ الحمد کی ابتدائی پرورش و پرداخت یثرب میں اپنی ماں کی گود میں اور ننہالی عزیزوں کے درمیان ہوئی۔ جب وہ بڑے ہوئے اور سات یا آٹھ سال کی عمر کو پہونچے تو ان کے چچا مطلب بن عبد مناف کو ان کے بارے میں خبر پہونچی، ابن سعد کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ مشہور اسلامی شاعر حضرت حسان بن ثابت خزرجی نجاری کے والد ثابت بن منذر بن حرام نجاری خزرجی عمرہ کرنے مکہ مکرمہ گئے تو مطلب بن عبد مناف سے ملے اور ان کے ہاں قیام کیا کہ وہ ان کے جانی دوست تھے اور ان کو شیبہ بن ہاشم کے بارے میں بتایا۔ مطلب بن عبد مناف نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کو مکہ مکرمہ واپس لائیں گے کہ وہ ان کا گھر ہے شیبہ بن ہاشم کی خزرجی ماں کسی طرح ان کو مدینہ سے جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں اور نہ ان کے ننہالی عزیز راضی تھے۔ مطلب بن عبد مناف نے ان سے اصرار جاری رکھا، تین دن تک ان کے مہمان رہے اور بالآخر ان کو راضی کر لیا۔ ماں اور ننہالی عزیز و اقارب مطلب بن عبد مناف کے دلائل سے زیادہ بھتیجے سے ان کی محبت و تعلق خاطر سے متاثر ہو گئے اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو قریش مکہ کے سردار و خاندانِ بنو عبد مناف کے شیخ کے حوالے کر دیا کہ وہ جوارِ حرم میں ان کو پروان چڑھائیں۔

ان روایات سے مکہ اور مدینہ اور قریش و خزرج کے درمیان تعلقات کی گوناگونی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ان کے اہم نکات پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

۱۔ عبد مناف بن قصی قریشی سردارِ مکہ کے دوستانہ روابط یثرب کے شیخ نجارو خزرج عمرو بن زید سے تھے، کہ عبد مناف اپنی شامی تجارت کے لیے جاتے ہوئے یثرب میں ان کے ہاں قیام کرتے تھے اور واپسی پر بھی ضرور رکتے تھے اور یثرب

کے عمرو بن زید بخاری خزرجی مکہ مکرمہ عمرہ، زیارت، حج اور تجارت کے لیے آتے تو اپنے قریشی دوست عبد مناف بن قصی کے ہاں قیام کرتے تھے۔

۲۔ عبد مناف کی دوستی ان کے فرزند ہاشم کو وراثت میں ملی اور وہ اپنے باپ کے دوست عمرو بن زید خزرجی کے دوست بن گئے۔ شامی تجارت کے لیے آتے جاتے ان کے ہاں قیام کرتے اور عمرو بن زید خزرجی بھی مکہ میں ان کے ساتھ ٹھہرتے۔

۳۔ ہاشم بن عبد مناف قریشی نے یثرب کے شیخ بخاری خزرجی کی دختر سے شادی کر کے دوستی کے تعلقات کو اور مستحکم کر دیا۔

۴۔ ہاشم کے فرزند شیبہ کی ولادت اور سات آٹھ برس تک پرورش یثرب میں ہوئی۔

۵۔ مطلب بن عبد مناف کے تعلقات ہاشم کی مدنی سسرال اور عزیزوں سے قائم ہوئے اور وہ مدینہ گئے تو ان کے ہاں ٹھہرے اور ان کے مہمان بنے اور مدینہ کے قیام کے بعد سیدھے وہ اپنے آخری سفر شام پر گئے۔

۶۔ مطلب اپنے یتیم بھتیجے اور ہاشم مرحوم کے فرزند شیبہ کو اپنے ساتھ مکہ لائے اور مدینہ سے روابط رکھے۔

۷۔ خاندانِ بنی عبد مناف کے ایک اور یثربی اور مدنی دوست ثابت بن منذر خزرجی تھے۔ دونوں میں رشتۂ مودت کے سبب مختلف قسم کے روابط و تعلقات تھے۔ ان میں دینی روابط کے علاوہ معاشرتی، تجارتی اور تہذیبی اور خاندانی رشتے بھی تھے

ہاشم بن عبد مناف کی ایک خزرجی خاتون سلمیٰ بنت عمرو بخاری سے شادی کی روایت بہت زیادہ مشہور ہے اور اس کی واحد وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ خاتونِ محترم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب بن ہاشم کی والدہ ماجدہ تھیں۔ لیکن جناب ہاشم نے ایک اور خزرجی خاتون سے شادی کی تھی اور غالباً وہ بھی مدینہ منورہ ہی میں کی تھی اور شاید کچھ پہلے۔ بلاذری نے عبد المطلب ہاشمی کے علاوہ دوسری اولادِ ہاشم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے دو فرزند صیفی اور ابو صیفی بھی تھے۔ ابو صیفی کا اصل نام عمرو تھا اور ان کے والد نے اپنا نام انھیں دیا تھا اور ان دونوں فرزندوں کی ماں ہند بنتِ عمرو بن ثعلبہ خزرجی تھیں۔[1]

۲۶۶

[1] بلاذری ۱/۸۷

ابن سعد کی روایت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اور مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو صیفی عمرو بن ہاشم اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے[1] اس سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خزرجی خاتون اور بیوۂ ہاشم ان کی موت کے بعد ان کے بھائی مطلب کی زوجہ بن گئی تھیں، اور ان سے اولاد بھی چلی تھی، جن میں اہم ترین شخصیت مخرمہ بن مطلب بن عبد مناف کی تھی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ میں دادا تھے۔ ان کے فرزند صلت بن مخرمہ تھے اور پوتے جہیم بن صلت بن مخرمہ بن مطلب صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے[2]

اس روایت سے یہ مزید واضح ہوتا ہے کہ ہاشم اور ان کے والد عبد مناف کے اہل یثرب سے تعلقات گہرے تھے۔ ہاشم کی اولین شادی بھی یثرب کے خزرجی قبیلہ میں ہوئی تھی جو ان کی سب سے بڑی اولادوں کی ماں تھیں اور ان کی دوسری شادی جو آخری بھی ہو سکتی ہے یثرب کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار کی ایک خاتون سے ہوئی تھی، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کی ماں اور آپؐ کی پردادی تھیں۔ ہاشم کی اولین بیوی۔ خزرجی و یثربی بیوی۔ بعد میں ان کے بھائی اور وصی مطلب بن عبد مناف کی بیوی اور ان کے بچوں کی ماں بن گئی تھیں۔ لہٰذا عبد المطلب کے علاوہ دوسرے فرزندان و دختران ہاشم بھی، مطلب بن عبد مناف کے پروردہ اور ان کے سوتیلے فرزند و دختر تھے۔ عبد المطلب کو مدینہ سے مکہ لانے کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ ان کے سوتیلے باپ اور ان کے سرپرست بن چکے تھے۔

## مدنی حجّاج و زائرین مکہ میں

یہ حقیقت کہ مدینہ منورہ کے لوگ زیارت و عمرہ اور حج کے لیے مکہ مکرمہ آیا کرتے تھے کسی شہادت کی محتاج نہیں کیونکہ یہ ایک مسلّمہ امر ہے اور اس سے انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو عقل سے بے بہرہ اور تعصّب و کج فہمی کا شکار ہو۔

---

[1] ابن سعد ۱/۷۹ - ۸۰

[2] اصابہ نمبر ۱۲۵۶، کتاب المتمق ۴۲۱

روایات میں بہرحال اس کے شواہد مل جاتے ہیں اور ان میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ ثابت بن منذر بن حرام خزرجی، مشہور شاعرِ مدینہ و خزرج حضرت حسان بن ثابت خزرجی کے والد ماجد عمرہ کے لیے مکہ گئے، جیسا کہ ذکر آچکا ہے، اور انھوں نے ہی مطلب بن عبد مناف کو ان کے یتیم بھتیجے عبدالمطلب کی اٹھان کے بارے میں خبر دی تھی۔

۲۔ اسلام سے قبل حضرت حسان بن ثابت خزرجی کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ حج کے لیے آئے تو عبدالمطلب ہاشمی کی اہلیہ نتیلہ بنت جناب نمری قاسطی سے ملاقات ہوئی جو اپنے فرزند ضرار بن عبدالمطلب کی گمشدگی پر رو رہی تھیں۔ ان کی حالت اتنی خستہ ہوگئی تھی کہ وہ پاگل سی ہوگئی تھیں۔ وہ مالدار خاتون تھیں اور موسم حج میں آہ و زاری کرنے کے علاوہ نذر دے رہی تھیں کہ اگر اللہ نے ان کے فرزند کو لوٹا دیا تو وہ کعبہ پر غلاف چڑھائیں گی۔ حضرت حسان خزرجی نے ان کے جزع و فزع پر اشعار کہے تھے اور ایک جذامی شخص کے ذریعہ سفید کپڑوں کا غلافِ کعبہ نذر کیا تھا۔[۱]

۳۔ مشہور روایات کے مطابق مطلب بن عبد مناف کو ان کے بھتیجے عبدالمطلب ہاشمی کے بارے میں خبر دینے والا ایک عرب قبیلہ بنو الحارث بن عبد مناۃ کا ایک شخص یثرب سے گذرا اور اس نے شیبہ کو کچھ لڑکوں کے ساتھ تیر اندازی کرتے اور ہر نشانہ پر ٹھیک بیٹھنے والے تیر پر ان کو "انا شیبۃ بن ھاشم" کہتے ہوئے سنا تو مکہ آکر اس حارثی نے مطلب کو ان کے بھتیجے کی خبر دی۔ ان دونوں روایات میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ حارثی نے بھی خبر دی تھی اور حضرت حسان کے والد نے بھی، دونوں ممکن ہیں۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب قبائل کے افراد و جماعات بھی ان دونوں شہروں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ خواہ وہ تجارت کے لیے ہو یا زیارت و عمرہ کے لیے۔[۲] حضرت حسان بن ثابت

---

[۱] بلاذری ۱/۸۹-۹۰ [۲] طبری ۲/۲۴۷-۲۴۸ (۲۶۸)

خزرجی اور ان کے والد ثابت اور دادا منذر کے بارے میں روایات کا بیان دلچسپ ہے کہ ان تینوں کی عمریں ایک سو بیس سال ہوئیں اور ان کے علاوہ کم خاندان ہوں گے جن میں تین تین نسلوں کے افراد - دادا، بیٹا اور پوتا - اتنی عمر کے ہوئے ہوں۔[1] ان کی عمروں بالخصوص حضرت حسان کے والد ثابت خزرجی اور مطلب بن عبد مناف قریشی کی عمر و زمانے کے مطابق مکہ و مدینہ اور قریش اور اوس و خزرج کے تعلقات و روابط کی تاریخ کم از کم ڈیڑھ سو سال قبل بعثتِ محمدی چلی جاتی ہے اور عبد مناف کے تعلقات کو پیشِ نظر رکھا جائے جن کی پختہ شہادت مل گئی ہے اور ان کے والد قصی کے زمانے کو حساب میں لے لیا جائے تو چوتھی صدی عیسوی سے ان دونوں قبیلوں اور حرمین شریفین کے درمیان روابط استوار نظر آتے ہیں۔

## عبد المطلب ہاشمی اور خاندانِ بنو عبد المطلب

عبد المطلب بن ہاشم قریشی کی والدہ ماجدہ سلمٰی بنتِ عمرو خزرجی کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب تک زندہ رہیں اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے فرزند سے ملنے اور اپنے مرحوم شوہر کے گھر کے لوگوں کے ساتھ رہنے کے لیے مکہ آئیں یا نہیں لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ انھوں نے اپنے سسرال سے تعلق باقی رکھا تھا جس طرح عبد المطلب بن ہاشم قریشی نے اپنی ماں اور اپنی ننہال سے رابطہ برابر قائم رکھا اور اس کو مضبوط تر کرتے گئے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد المطلب ہاشمی کی ایک جائداد ذوالہرم نامی طائف میں تھی۔ وہ دراصل ایک چشمہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ تھا۔ وہ مدتوں سے ثقیف کے قبضہ میں تھا۔ عبد المطلب نے جب اپنی جائداد کا مطالبہ کیا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ شیخ ثقیف جندب بن حارث ثقفی اور عبد المطلب ہاشمی نے منافرہ کے لیے عذری کاہن کا انتخاب کیا جس کا نام غزی سلمہ

---

[1] اصابہ، ۱۷۴؛ اسد الغابہ، استیعاب میں ترجمہ حضرت حسان بن ثابت خزرجی نیز دوسرے مصادر سیرت و شاعری

تھا اور جو شام میں رہا کرتا تھا۔ دونوں فریق کاہن کے پاس گئے۔ عبدالمطلب ہاشمی قریش کی ایک جماعت کے ساتھ گئے جس میں ان کے فرزند حارث بھی شامل تھے۔ اس وقت تک وہی اکلوتے فرزند تھے، کاہن نے جائداد اور منافرہ دونوں کا فیصلہ عبدالمطلب ہاشمی میں کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سفر میں وہ مدینہ ضرور گئے تھے۔[1]

ایک اور منافرہ چشمۂ زمزم کے سلسلے میں عبدالمطلب ہاشمی اور بقیہ قریش کے درمیان ہوا تھا۔ جب عبدالمطلب نے چاہِ زمزم دریافت کر لیا تو اکابرِ قریش نے ان سے اپنا حق مانگا کہ چشمہ تو ان سب کے مشترکہ جدامجد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی میراث ہے۔ سعد ہذیم کی کاہنہ کو حکم بنایا گیا جو شام کی سرحد کے قریب سکونت رکھتی تھی۔ فریقین شام کے لیے روانہ ہوئے اور ابھی سرحدِ عرب تک نہ پہونچے تھے کہ قریش کے زادِ راہ کا پانی ختم ہو گیا۔ عبدالمطلب نے پیاسے قریشیوں کو پانی پلایا تو ان کو ندامت ہوئی اور انھوں نے منافرہ کرنے سے احتراز کیا اور عبدالمطلب کے حق کو تسلیم کر لیا۔ اس سفر کے دوران بھی ان کا آتے جاتے دونوں مواقع پر گذر مدینہ سے ہوا اور ظاہر ہے کہ وہ اپنے عزیزوں سے ملے تھے۔[2]

خاندانِ بنو عبد مناف میں ایک منافرہ عبدالمطلب ہاشمی کا ان کے چچا نوفل بن عبد مناف کے ساتھ ہوا۔ بنائے مخاصمت زمین و آراضی تھی۔ بلاذری کے مطابق مطلب بن عبد مناف کے انتقال کے بعد عبدالمطلب ہاشمی بے سہارا رہ گئے چنانچہ ان کے دوسرے چچا نوفل نے عبدالمطلب کی ارکاح (ساحات وافنیہ۔ میدانی آراضی) پر دیدہ دلیری سے قبضہ کر لیا۔ عبدالمطلب نے اس غاصبانہ قبضہ کے خلاف اپنے خاندان و قوم ۔ بنو عبد مناف اور قریش ۔ سے فریاد کی لیکن کسی نے ان کے خاندانی جھگڑے میں پڑنا پسند نہیں کیا۔ مجبوراً عبدالمطلب ہاشمی کو اپنے ننہالی رشتہ داروں بنو النجار/ خزرج سے استعانت کرنی پڑی۔ راویوں کا بیان ہے کہ ان کی ایک کثیر جماعت اور بقول بغدادی اسّی افراد کی فوج مکہ آئی۔ انھوں نے

---

[1] ابن سعد ۱/۸۸؛ بلاذری ۱/۷۴-۷۵؛ بغدادی، کتاب المنمق ۹۸-۱۰۳؛ مزید بحث: مضمون عبدالمطلب ہاشمی۔

[2] ابن ہشام ۱/۱۵۵-۱۵۶؛ سہیلی ۲/۹۶-۹۸، ۱۲۰ و مابعد، مضمون عبدالمطلب ہاشمی۔ رسول اکرمؐ کے دادا۔

صحن کعبہ کے قریب اپنے اونٹ روکے اور تیر و کمان سے لیس ہو کر جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ چچا نوفل نے یہ صورت حال دیکھی تو گھبرائے، ان سے بات چیت کی اور چپکے سے ارکاح عبدالمطلب ہاشمی کو واپس کر دی بلکہ حسن سلوک میں کچھ مزید آراضی بھی ان کو دی، اور اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کیا اور عذر بھی پیش کیا۔ بنو النجار (خزرج کے رشتہ دار) واپس مدینہ چلے گئے[1] بعض راویوں کا یہ بیان کہ اس کے بعد بنو عبد مناف میں دراڑ پڑ گئی۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک طرف ہو گئے اور بنو عبد شمس اور بنو نوفل کا گروہ دوسرا بن گیا، جزوی طور سے صحیح ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ عارضی طور سے ایسا ہو، مگر یہ مستقل واقعہ امری نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا[2]

عبدالمطلب ہاشمی کے مدینہ منورہ اور خزرج کے پاس ملاقات کے لیے جانے کا ذکر نہیں ملتا یا کم ملتا ہے لیکن وہ بقول ابن اسحاق "صاحبُ عیرِ مکہ" (کاروانِ تجارتِ مکہ کو منظم کرنے والے) تھے اور ان کے بھتیجے حرب بن امیہ ان کے تجارتی شریک و ندیم تھے اور بعد میں عبداللہ بن جدعان تیمی ان کے ندیم و شریکِ تجارت و کاروبار بن گئے تھے۔ ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شامی تجارت سے وابستہ رہے تھے اور شام آتے جاتے رہتے تھے۔ اپنے ان اسفار میں ان کا گذر اور قیام لازمی طور سے مدینہ منورہ سے اور بنو خزرج کے عزیزوں کے ساتھ رہتا تھا اور یہ پرانا تعلق و ربط تھا[3]

## زبیر بن عبدالمطلب اور عبداللہ بن عبدالمطلب

بہر حال عبدالمطلب ہاشمی کے دو فرزندوں کی مدینہ زیارت، قیام اور بنو خزرج کے ننہالی رشتہ داروں سے تعلق کا پکا ثبوت ملتا ہے ۵۷۱ء کے آغاز میں عبدالمطلب

---

[1] بغدادی، کتاب المنمق ۸۴-۸۸؛ بلاذری ۱/۶۹-۷۰؛ عبدالمطلب ہاشمی۔ رسول اکرمؐ کے دادا۔

[2] بحث کے لیے ملاحظہ ہو: خاندان بنو عبد مناف کے دو سماجی طبقات؛ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات

[3] بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات؛ باب اول؛ عبدالمطلب ہاشمی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا؛ تفصیلات کے لیے ابن سعد ۱/۸۷؛ ابن ہشام ۱/۵۰-۵۱؛ بلاذری ۱/۷۳-۷۴؛ کتاب المحبر ۱۷۳؛ کتاب المنمق ۵۵:

کے فرزندِ دلبند عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی تجارت کے لیے شام گئے۔ بلاذری وغیرہ کے مطابق عبداللہ کی مدینہ آمد کا مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بنو عدی بن النجار کے ننہالی رشتہ داروں کی زیارت کے لیے گئے تھے۔ بعض روایات کے مطابق وہ مدینہ منورہ سے کھجوریں لینے کے لیے گئے تھے۔ لیکن اول الذکر روایت کو زیادہ ثقہ ومعتمد مانا گیا ہے[1] قریشی قافلے کی شام سے واپسی پر عبداللہ ہاشمی بیمار ہوگئے چنانچہ مدینہ منورہ پہونچ کر ان کو ان کے ننہالی رشتہ داروں کے ہاں دوا، علاج اور تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ مکی کاروانِ تجارت نے مکہ مکرمہ پہونچ کر عبدالمطلب ہاشمی کو فرزندِ عزیز کی بیماری کی خبر دی تو بوڑھے شفیق باپ نے اپنے دوسرے فرزند زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی کو بیمار بیٹے کی تیمارداری اور خبر گیری کرنے اور صحت کے بعد مکہ مکرمہ لانے کے لیے مدینہ بھیجا۔ زبیر ہاشمی یثرب پہونچے تو عبداللہ ہاشمی کی بیماری ناقابلِ علاج ہو چکی تھی اور کچھ دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ زبیر نے اپنے بھائی کی مدینہ کے دارالنابغہ کے قبرستان میں تدفین کی اور واپس مکہ لوٹ گئے۔ بعض روایات کے مطابق وہ ان کے انتقال کے بعد مدینہ پہونچے تھے۔ بہرحال وہ عبداللہ ہاشمی کا مال واسباب وترکہ بھی مکہ لائے[2]

## حضرت عباس بن عبدالمطلب

مکہ مکرمہ کے خاندانِ بنو عبد مناف کے تمام افراد ورجال کے مدینہ منورہ اور خاص کر بنو عدی بن نجار/خزرج سے ہمیشہ روابط رہے۔ ننھالی رشتہ داری عرب سماج میں بڑی قدر وقیمت اور دور رس سیاسی اثرات کی حامل رہی تھی۔ اس لیے ازدواجی تعلقات مختلف خاندانوں اور قبیلوں سے قائم کیے جاتے تھے۔ اور وہ اپنے

[1] بلاذری ۱/۹۲

[2] ابن سعد ۱/۹۹؛ بلاذری ۱/۹۲؛ ابن ہشام ۱/۱۶۱؛ سیرت حلبیہ ۱/۶۳-۶۴؛ دیار بکری ۱/۲۱۱، طبری ۲/۱۵ اور ۲۴۶ بحوالہ امام زہری وواقدی وترجیح روایت واقدی؛ عبدالمطلب ہاشمی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا؛ نیز مضمون عم نبوی زبیر بن عبدالمطلب اور سیرت نبوی، شبلی ۱/۱۶۹؛ ادریس کاندھلوی ۱/۴۵-۴۶ بحوالہ زرقانی ۱/۱۰۹ مودودی سیرت ۲/۹۰؛ ابوالحسن ندوی ۹۹؛ جعفر شاہ پھلواری؛ صفی الرحمٰن مبارکپوری ۸۱-۸۲ وغیرہ۔

دامادوں اور ان کی اولادوں کے لیے ہمیشہ سراپا مہر و شفقت اور محبت و خاطر ثابت ہوتے اور اس نازک رشتہ کا لحاظ کرتے۔ حضرت عبدالمطلب بن ہاشم اور ان کی اولادوں کو بنو عدی بن نجار / خزرج نے ہمیشہ "اپنی بہن کی اولاد" ہی سمجھا اور اس کی ہمیشہ رعایت کی۔ حدیث نبوی میں ارشاد گرامی ہے۔ ابن اخت القوم منہم[1] اس کی ایک اور مثال ان تعلقاتِ حرمین کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی غزوہ بدر ۲ھ / ۶۲۴ء میں مسلمانانِ مدینہ کے ہاتھوں قید ہوئے اور جنگی اسیر بنے۔ اسیرانِ بدر کے لیے جب مہرِ نبوی سے فدیہ لینے اور آزاد کرنے کا فیصلہ ہوا تو امام بخاری کی ایک روایت بسند حضرت انس بن مالک خزرجی کے مطابق "انصار کے کچھ مردانِ کار نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ ہمیں ہماری بہن کے فرزند عباس کا فدیہ معاف کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! تم ان سے ایک درہم بھی نہیں چھوڑ سکتے"[2] حافظ ابن حجر نے "ابن اختنا" کی تشریح میں حضرت عبدالمطلب ہاشمی کی والدہ ماجدہ سے رشتہ داری کا حوالہ دیا ہے[3]

انھیں حضرت عباس ہاشمی کے بارے میں شامی تجارت کے حوالے سے یہ ذکر آتا ہے کہ وہ تجارت کے لیے شام جاتے تھے تو مدینہ منورہ سے گذرا کرتے اور وہاں قیام کرتے تھے اور ان میں سے کئی ایک سے ان کے تعلقات استوار تھے اور معروف تو تھے ہی۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی اور مدینہ منورہ کے دو اکابر حضرات کعب بن مالک خزرجی اور براء بن معرور خزرجی سے تعلقات تھے اور وہ ان دونوں کے شناسا تھے کہ وہ برابر مدینہ منورہ کے لیے جایا کرتے تھے[4] اس روایت کا ایک خوبصورت نکتہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ان دونوں

---

[1] بخاری کتاب المناقب، باب عنوان ہذا؛ فتح الباری ۶/ ۶۷۵ وغیرہ۔

[2] کتاب المغازی، باب ۱۲- بلاعنوان، حدیث ۴۰۱۸؛ فتح الباری ۷/ ۴۰۰ ومابعد

[3] فتح الباری ۷/ ۴۰۴

[4] ابن ہشام ۲/ ۴۸-۴۹؛ سہیلی ۴/ ۸۰-۸۱ وغیرہ

حضرات کا تعارف کرایا گیا تو آپ نے حضرت کعب بن مالک کو شاعر کی حیثیت سے پہچانا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ والوں سے واقف تھے۔

## نبوی تعلقات ۔ قبل از بعثت

خاندانِ بنی عبد مناف کے چند اور افراد کی زیارتِ مدینہ کا واضح ذکر ہماری روایاتِ سیرت میں ملتا ہے۔ ان میں سے مشہور ترین اور عظیم ترین زیارت و سفر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو آپ نے اپنے بچپن میں کیا تھا۔ روایات میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف چھ سال کی ہوئی تو آپؐ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب زہری آپ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ تشریف لے گئیں۔ ان کے ساتھ آپ کی "انا" ام ایمن حبشیہ بھی تھیں۔ بعض کے مطابق اس سفر کا مقصد بی بی آمنہ کے شوہر مرحوم عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے قبر کی زیارت کرنا تھا۔ جب کہ بعض دوسروں کے مطابق وہ بنو النجار/خزرج کے ننہالی رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئی تھیں۔ تطبیق دینے والے قدیم و جدید سیرت نگاروں اور محدثوں نے ان دونوں مقصدوں کو ان کے پیشِ نظر ہونا بتایا ہے۔[1]

---

[1] ابن ہشام ۱/۱۷۹ ان ام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امنہ توفیت و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ست سنین بالأبواء بین مکۃ والمدینۃ: کانت قد قدمت علی أخوالہ من عدی بن النجار تزیرہ ایاھم، فماتت وھی راجعۃ بہ الی مکۃ۔

قال ابن ھشام: ام عبد المطلب بن ھاشم سلمی بنت عمرو النجاریۃ، فھذہ الخؤلۃ التی ذکر ابن اسحاق لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیھم۔ ۱/۱۸۰۔ سہیلی ۲/۱۸۴–۱۸۷ بحث بروفات وایمان وعدم ایمانِ آمنہ۔ زیارتِ مدینہ اور مقصد سے بحث ندارد؛ ابن سعد ۱/۱۱۶–۱۱۷؛ بلاذری ۱/۹۴؛ طبری ۲/۲۴۶ نیز ۱۶۵ بالخصوص ۱۶۵–۱۶۶ بطابق ابن ہشام؛ ابن سید الناس ۱/۵۵ بحوالہ ابن اسحاق۔ شبلی ۱/۱۷۵: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کی ننہال خاندانِ نجار میں تھی، وہیں ٹھہریں.... مورخین نے لکھا ہے

سہیلی کی تشریح میں ساری بحث بی بی آمنہ کی وفات اور ان کے ایمان لانے یا نہ لانے سے متعلق ہے اور ان کی زیارتِ مدینہ اور اس کے مقصد و محرک سے کوئی تعلق نہیں رکھا ہے۔ گویا کہ ابن اسحاق و ابن ہشام کو کافی سمجھا ہے۔ ابن سعد کی روایت میں کچھ اضافے ہیں: (۱) آمنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے ننہالی رشتہ داروں (اخوالہ) بنو عدی بن النجار کی زیارت کرانے کے لیے مدینہ گئیں (۲) آپؐ کے ساتھ آپ کی انا (حاضنۃ) ام ایمن بھی تھیں۔ (۳) وہ دو اونٹوں پر سوار ہو کر گئے (۴) بی بی آمنہ آپؐ کو لے کر دار النابغہ میں مقیم ہوئیں (۵) ان کے پاس آپؐ کے ساتھ ایک ماہ قیام کیا (۶) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں اپنے اس قیام مدینہ کے واقعات بیان فرمایا کرتے تھے۔ (۷) آپؐ نے (بعد ہجرت) بنو عدی بن النجار کی گڑھی (اطم) دیکھی تو فرمایا کہ (الف) میں اس گڑھی میں ایک لڑکی انیسہ نامی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ (ب) میں اپنے ننہالی رشتہ داروں (اخوالی) کے بچوں کے ساتھ وہاں بیٹھنے والے پرندوں کو اڑایا کرتا تھا۔ (ج) دار (احاطہ) کی طرف دیکھا

---

= ہے کہ آپ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں لیکن یہ رشتہ دُور کا رشتہ تھا۔ قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے۔ میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے گئی تھیں جو مدینہ میں مدفون تھے..." ۔ سلیمان منصور پوری ۲/۹۴: "....اور پھر ان کو ساتھ لے کر یثرب گئیں ننہال کے ملنے کا بہانہ تھا اور غالباً بے وطن متوفی شوہر کی مٹی دیکھنے کا شوق دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں ایک مہینہ تک دار النابغہ میں قیام کیا..."۔ ادریس کاندھلوی ۱/۸۵: "...حضرت آمنہ نے مدینہ کا قصد فرمایا اور آپ کو بھی ساتھ لے گئیں... ایک ماہ اپنے میکہ میں قیام کیا" مودودی ۲/۹۹: ..."بی بی آمنہ آپ کی پردادی (جناب عبد المطلب کی والدہ) کے خاندان بنی عدی بن نجار سے ملانے کے لیے آپ کو ام ایمن کے ساتھ مدینے لے گئیں اور ایک مہینہ وہاں رہیں..." بحوالہ ابن اسحاق و ابن سعد، ابن حزم و ابن قیم ۔ ابو الحسن علی ندوی ۱۰۲: "...خرجت به امه الی المدینة یثرب، تزیره خئولة جده فیها وتزور قبر بعلها لحبیب..." مبارکپوری ۸۷ ـ ۸۸: ..." حضرت آمنہ کا ارادہ ہوا کہ وہ اپنے متوفی شوہر کی یادِ وفا میں یثرب جا کر ان کی قبر کی زیارت کریں چنانچہ وہ اپنے یتیم بچے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی خادمہ ام ایمن اور اپنے سرپرست عبد المطلب کی معیت میں کوئی پانچ سو کلومیٹر کی مسافت طے کر کے مدینہ تشریف لے گئیں"

تو فرمایا کہ یہاں میری ماں میرے ساتھ ٹھہری تھیں (د) اور اسی احاطہ میں میرے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر ہے (س) میں بنو عدی بن النجار کے کنویں (یا تالاب (بئر) میں خوب پیراکی کیا کرتا تھا۔ (ط) کچھ یہودی قوم کے لوگ آپؐ کو دیکھنے آیا کرتے تھے اور بقول ام ایمن کہا کرتے تھے کہ آپ اس امت کے نبی ہیں اور یہ شہر آپ کا دارِ ہجرت ہے (۸) آپؐ کی والدہ آپ کو لے کر مکہ واپس ہوئیں (۹) جب وہ سب ابواء میں تھے تو آمنہ بنت وہب کا انتقال ہوگیا (۱۰) ان کی قبر وہیں ہے (۱۱) ام ایمن آپؐ کے ساتھ ان دونوں اونٹوں پر مکہ واپس آئیں (۱۲) وہ آپؐ کی والدہ ماجدہ کے ساتھ آپ کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔

بلاذری کی مختصر روایت میں بعض نئی اور اہم معلومات ہیں جو بالعموم ہمارے سیرت نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ کی والدہ مدینہ میں اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کرنے لیے گئیں جیسا کہ وہ زیارت کے لیے جایا کرتی تھیں۔ دوم یہ کہ بی بی آمنہ کے ساتھ اس سفر میں عبدالمطلب بھی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انا ام ایمن بھی: ومعہا عبدالمطلب وام ایمن۔ دوسری روایت میں جو لفظ یقال (کہا جاتا ہے) سے شروع کی ہے کہ یہ دراصل عبدالمطلب تھے جو بنو النجار کے اپنے ننہالی رشتہ داروں سے ملاقات کرنے اور ان کی زیارت کرنے آئے تھے۔ اور اپنے ساتھ آمنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لائے تھے۔ اور یہی سب سے زیادہ قرینِ صحت روایت ہوسکتی ہے۔

تمام قدیم وجدید سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے سفرِ مدینہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں کے سفر کے طور پر بیان کیا ہے اور اس کی طرح ابن اسحاق اور ان کے بنیادی راویوں نے ڈالی ہے۔ بعد میں آنے والے اہلِ قلم اور سیرت نگاروں نے ابن اسحاق وغیرہ کے قدیم اندازِ نگارش اور طرزِ پیشکش کو پوری طرح قبول کرلیا۔ اس کے نتیجے میں کئی غلطیوں کے علاوہ مختلف نوعیت کے ابہام بھی پیدا ہوگئے۔

قدیم روایات میں یہ ذکر واضح طور سے ملتا ہے کہ حضرت آمنہ آپؐ کے ننہالی رشتہ داروں (اخوالہ) سے ملنے کے لیے تشریف لے گئی تھیں۔ حالانکہ وہ

بنی عدی بن نجار/خزرج نہ تو آپؐ کے "اخوال" تھے اور نہ آپؐ کی والدہ ماجدہ کے۔ وہ دراصل آپ کے دادا عبدالمطلب کے "اخوال" تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو پردادی کے رشتہ سے وہ ان کے ددھیالی عزیز و قریب تھے اور بی بی آمنہ کے رشتہ سے اور ان کے مرحوم شوہر حضرت عبداللہ کے لحاظ سے ددھیالی رشتہ ہی بنتا ہے۔ بعض راویوں نے محض قیاس وتخمین کی بنا پر مرحوم شوہر کی قبر کی زیارت کا محرک تلاش کیا جو عرب روایات کے خلاف ہے اور قیاس واستنباط کے بھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شوہر کی وفات کے چھ سال بعد ان کی زیارت کا شوق کیوں کر پیدا ہوا۔ پھر اس مقصد سے سفر کر کے ایک ماہ دور کے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرنا اور بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ رشتہ داروں سے ملاقات و زیارت کی خاطر جانے کے سبب اتنا طویل قیام مہمانی سمجھنے اور سمجھ میں آنے والی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام روایات میں ان دو خواتین کا دو اونٹوں پر ایک لڑکے کے ساتھ مدینہ منورہ کے پانچ سو کلومیٹر کا سفر کرنا ناممکن تھا۔ اس میں کم از کم ایک ہفتہ ورنہ ایک عشرہ لگتا تھا۔ آمد و رفت کے بیس دنوں میں بغیر مرد اور کارواں کے سفر کرنا جان جوکھم کا کام تھا اور عبدالمطلب جیسے شفیق و کریم دادا کی موجودگی میں جو ایک لمحہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہوتے پر مضطرب ہو جاتے تھے، قطعی ناممکن تھا۔ ننہالی رشتہ بڑا عزیز و دیرپا ہوتا تھا اور نسل در نسل اس کا اثر رہتا تھا اور عبدالمطلب کی تو ماں کا گھر تھا۔

حقیقی صورت حال یہ تھی کہ ۵۷۶ء کے قریب عبدالمطلب ہاشمی نے مدینہ کا سفر کیا تھا جیسا کہ بلاذری کی ایک روایت ہے۔ یہ ان کا وہ سفر تھا جو انھوں نے اپنے ننہالی رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے کیا تھا اور وہ اکثر بقول بلاذری جایا کرتے تھے حالانکہ زیارتِ مسلسل کی نسبت آمنہ کی طرف کی ہے کہ وہی ان کے نزدیک محرک و بانیِ سفر مدینہ تھیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ عبدالمطلب اکثر مدینہ جایا کرتے تھے۔ زیارت مقصد تھی اور تجارت بھی رہی ہوگی اور اس بار جب وہ مدینہ تشریف لے گئے تو اپنی بہو اور پوتے کو بھی ساتھ لے گئے اور ظاہر ہے کہ وہ ایک کارواں کے ساتھ گئے تھے جس کا ذکر نہیں ملتا۔

# اوس وخزرج کی قریشِ مکہ سے حلف کی مساعی

بنیادی طور سے مدینہ منورہ کے دونوں عرب قبیلہ اوس وخزرج ایک دوسرے کے قریبی عزیز تھے اور خون کے رشتہ دار۔ لیکن قبائلی اور سیاسی اختلافات نے ان کو دو متحارب قبیلوں میں منقسم کر دیا تھا اور وہ مسلسل ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ یہ دراصل یہودی سازش تھی، ان کے متعدد قبیلے مدینہ میں آباد تھے اور وہ آبادی کے لحاظ سے عربوں سے بہت کم تھے، لیکن تمام وسائلِ پیداوار اور قومی دولت وسیادت پر وہ قابض ہو گئے تھے اور یہ قبضہ ان کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی پر مبنی تھا۔ اس لیے وہ بڑی حکمت وہوشیاری کے ساتھ اوس وخزرج کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف آمادۂ پیکار رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اوس وخزرج دونوں کے قبیلوں سے حلف کے معاہدے کر رکھے تھے۔ بعض یہودی قبیلے اوس کے حلیف بن گئے تھے اور بعض خزرج کے۔ ابنِ ہشام کے مطابق بنو قینقاع اور ان کے ہمنوا خزرج کے حلفاء تھے اور بنو النضیر وبنو قریظہ اور ان کے ہمنوا اوس کے حلیف تھے۔ وہ ان کو جنگ میں تعاون دیتے تھے اور زمانۂ امن میں ان کو ہتھیار اور قرض فراہم کیا کرتے تھے۔[1]

اوس وخزرج میں عددی اعتبار سے خزرج کو برتری حاصل تھی اور فوجی، سیاسی اور مالی لحاظ سے بھی وہ فائق تھے۔ باہمی اختلاف اور خانہ جنگی نے ان کو خاصا کمزور کر دیا تھا اور ان کو یہودی حلیفوں پر زیادہ بھروسہ بھی نہیں رہا تھا۔ شاید وہ کسی حد تک ان کی حکمتِ عملی بھی سمجھنے لگے تھے۔ بالخصوص جنگِ بعاث ۶۱۵ء کے بعد وہ دونوں نئے حلیفوں کی تلاش میں تھے۔ اس مقصد کے لیے ان کی نگاہ لازمی طور سے قریشِ مکہ کی طرف اٹھتی تھی کیونکہ عربوں میں وہ سب سے طاقتور فریق تھے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس و

---

[1] ابن ہشام ۲/۳۸ بالخصوص ۱۶۴-۱۶۵؛ سہیلی ؛ بلاذری ۱/۲۳۸؛ ابن سعد ۱/۲۱۹؛ سمہودی

خزرج دونوں کے وفود اس مقصد کے لیے مکہ مکرمہ آنے لگے تھے۔ ان میں شاید اوس نے پہل کی تھی کہ وہ کمزور فریق تھے اور خزرج کے خلاف اک طاقتور حلیف کی تلاش میں تھے اور قریش سے بہتر کون حلیف بنتا۔[1]

ابن اسحاق کی ایک روایت میں ہے کہ ابوالحیسر انس بن رافع اوسی اپنے قبیلہ بنو عبد الاشہل / اوس کے ایک نوجوان گروہ کے ساتھ مکہ آئے۔ ان میں ایک نوجوان ایاس بن معاذ بھی شامل تھے جو غالباً اپنے فہم وعقل کی بنا پر رکن بنے تھے، وہ اپنی قوم خزرج کے خلاف حلف کرنے کے لیے مکہ پہونچے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کی خبر ملی تو آپؐ نے ان سے ملاقات کر کے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ایاس بن اوس نے اس کو حلفِ قریش سے بہتر گردانا اور اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیا، مگر رئیسِ وفد نے انکار کر دیا اور ایاس کو برا بھلا کہا، شاید قریش سے حلف کا معاہدہ نہ ہو سکا اور وفد مدینہ واپس چلا گیا۔ روایت کے مطابق یہ وفد اوسی جنگِ بعاث سے قبل آیا تھا، کیونکہ حضرت ایاس کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اس واقعہ کے بعد انتقال فرما گئے اور ان کو ان کے ساتھی اور رفیق مسلم گردانتے تھے، کیونکہ وہ وفات کے وقت کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہے تھے جو انھوں نے آپؐ سے سنا تھا۔[2] بلاذری میں کچھ اضافہ ملتا ہے اور اختلاف بھی۔ اول یہ کہ اوس کی ایک قوم مکہ آئی تھی تاکہ خزرج کے خلاف قریش سے حلف کریں۔ کیونکہ ان کے درمیان حرب وجنگ ہوتی رہتی تھی۔ دوم یہ کہ انس بن رافع نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو ردِّ عمل ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ ہم اپنے دشمنوں کے خلاف قریش سے معاہدۂ حلف کرنے آئے تھے اور اب واپس ہوں تو قریش ہی ہمارے دشمن بن جائیں۔[3]

بلاذری نے مدینہ کے انصار کے مکہ آنے کے بارے میں ایک عمومی روایت بیان کی ہے جو حقیقتِ واقعہ کی غمّاز وعکّاس ہے۔ لکھا ہے کہ انصار کی قوم یکے

---

[1] بلاذری ۲۳۸/۱

[2] ابن ہشام ۳۶/۲-۳۷؛ سہیلی ۶۲/۴، ۶۷-۶۸؛ بلاذری ۲۳۸/۱

[3] بلاذری ۲۳۸/۱

بعد دیگرے مکہ مکرمہ مختلف کاموں سے آیا کرتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دعوت دیا کرتے تھے۔ بعض اہلِ مدینہ کہا کرتے تھے کہ ہم اس کام سے نہیں آئے اور بعض کچھ نہیں کہتے اور خاموشی اختیار کرتے۔ پھر قیس بن الخطیم آئے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوت دی۔ پیغامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سن کر انھوں نے کلامِ عجیب کی تعریف کی اور اگلے سال تک کی مہلت مانگی کہ واپس آکر جواب دوں گا لیکن سال گزرنے سے پہلے وہ مر گئے[1]

اگرچہ سوید بن صامت کی مکہ آمد معاہدۂ حلف کی خاطر نہ تھی مگر وہ بہرحال مکہ والوں سے ایک مدنی شخصیت کے تعلق کو اجاگر کرتی ہے۔ مختلف اہلِ قلم نے ان کی آمد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جنگِ بعاث سے پہلے مکہ آئے تھے۔ مقصد عمرہ کرنا تھا یا حج کرنا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات ہوئی تو کلامِ ربی کو پسند کیا، مگر اسلام قبول نہ کیا۔ مدینہ واپس گئے تو قتل کر دئے گئے اور ان کے قتلِ ناحق نے ہی جنگِ بعاث بھڑکائی۔ ان کے عقیدت مندوں اور رشتہ داروں کا خیال تھا کہ وہ مسلم ہو چکے تھے[2]

## شامی تجارت کے حوالہ سے

مکہ مکرمہ سے شام جانے والے تمام کارواں اور تجارتی قافلے آتے جاتے مدینہ / یثرب سے گذرتے تھے۔ عہدِ جاہلی اور عہدِ اسلامی دونوں میں یثرب / مدینہ قریش اور دوسرے عرب تاجروں کے لیے ایک اہم منزل کا کام دیتا تھا۔ یثرب خود ایک اہم تجارتی منڈی تھا اور کم از کم کھجور کی ضروریات کے لیے مکہ والے اسی کی طرف رجوع کرتے اور خریدا کرتے تھے، جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے۔ اور عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے آخری تجارتی سفر کی بابت ایک روایت یہ بھی آتی ہے کہ ان کے والد ماجد نے ان کو یثرب سے ہی کھجوریں لانے کے لیے

---

[1] بلاذری ۱/۲۳۸

[2] بلاذری ۱/۲۳۸؛ ابن ہشام ۲/۳۴-۳۶؛ سہیلی ۴/۴۰-۴۱-۱۵-۶۷؛ نیز کتب سیرت و تاریخ۔

بھیجا تھا۔ مدینہ کھجوروں کی پیداوار اور فروخت کے لیے مشہور تھا۔ ان دو اسباب سے بھی اہلِ مکہ و افرادِ قریش کے سماجی تعلقات اہلِ یثرب و مدینہ سے مدتوں سے قائم ہو چکے تھے۔ ان کا مفصل تذکرہ تو "قریشِ مکہ کی شامی تجارت" نامی مقالے میں آچکا ہے۔ یہاں صرف ان کے بعض اکابر کے یثرب و مدینہ سے تعلقات کا ذکر مختصر نکات کی صورت میں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق بکثرت مدینہ سے گذرا کرتے تھے، دورِ جاہلی میں بھی اور اسلامی عہد کے شروع میں بھی۔ اس لیے وہ مدینہ والوں میں معروف تھے۔

۲۔ حضرت زبیر بن عوام اسدی تجارتِ شام کے لیے جاتے ہوئے مدینہ منورہ سے گذرا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی شامی تجارت کے لیے معروف تھے، وہ کئی بار یثرب و مدینہ سے گذرے تھے۔

۴۔ رسولِ اکرمؐ حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم جوانی میں قریشی تجارتی سلسلے سے منسلک ہوئے تو مختلف بازاروں سے تجارت کے علاوہ شام سے تجارت کے لیے بھی کئی بار تشریف لے گئے۔ کم از کم دو تین بار تو صرف حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اسدی کے تجارتی سلسلے سے وابستہ ہونے کے سبب شام تشریف لے گئے اور ہر بار مدینہ منورہ سے گذرے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ نے وہاں قیام بھی فرمایا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ہماری روایات میں ان کی تفصیلات نہیں ملتیں۔

۵۔ ابوطالب بن عبد المطلب ہاشمی نے ۵۸۳ء کے لگ بھگ اپنا مشہور سفرِ تجارت کیا تھا جس میں رسول اکرم صلی اللہ بھی بارہ سال کی عمر میں تشریف لے گئے تھے۔ ابوطالب ہاشمی کا یہ سفرِ شام اکلوتا نہیں تھا۔ روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قومی تجارت اور آبائی کاروبار کے فروغ کے لیے برابر شام آیا جایا کرتے تھے اور یثرب سے گذرا کرتے تھے۔

۶۔ ابولہب ہاشمی بن عبد المطلب اور اس کا فرزند عتبہ ہاشمی بھی شامی تجارت سے وابستہ تھے اور ابولہب نے ہی عتبہ کو شامی تجارتی سفر پر بھیجا تھا جہاں ایک شیر کے ہاتھوں اس کی زندگی کا خاتمہ حوران نامی شہر میں ہوا۔ یہ مکی عہدِ نبوی کا واقعہ

ہے۔ غالباً وسطِ عہد کا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیغام کی مخالفت میں دونوں باپ بیٹے حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔

۷۔ اسود بن عبد المطلب اسدی اور اس کا فرزند زمعہ بن اسود بھی تجارت کے لیے برابر شام جایا کرتے تھے۔

۸۔ مشہور دشمنِ اسلام ابوجہل مخزومی شامی تجارت سے وابستہ تھا اور اس کے قافلے برابر شام جاتے رہتے تھے۔ مکی دورِ نبوی میں اس کی تجارتِ شام کا قرینہ ملتا ہے، مگر مدنی دور میں روایات کی گواہی بھی اس قرینہ کو شہادت کا درجہ دے دیتی ہے۔ حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی کے اولین اسلامی سریہ سیف البحر کے دوران ناحیہ العیص میں جس قریشی تجارتی کارواں سے مسلمانوں کی مڈبھیڑ ہوئی تھی اس کا امیرِ کارواں ابوجہل بن ہشام ہی تھا جو تین سو مکی سواروں کے ساتھ شام سے آرہا تھا۔[1]

۹۔ اسی فرعونِ امت کے فرزند عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کی قیادت میں ایک اور قریشی تجارتی قافلے سے مڈبھیڑ سریہ عبیدہ بن حارث مطلبی کی تاخت کے زمانے میں ہوئی تھی۔ یہ قافلہ بھی شامی تجارت کے سفر سے واپس آرہا تھا۔[2]

۱۰۔ ایک اور مکی حلیف حضرت نضر بن سفیان ہذلی کے کاروانِ تجارت کے شام جانے کا واضح ذکر روایات میں ملتا ہے۔[3]

تمام تفصیلات کا پیش کرنا یہاں ضروری نہیں اور نہ ممکن ہے۔ اس کا اصل محل شامی تجارت کا موضوع ہے۔ ان سے بہرحال یہ واضح و ثابت ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ اور دوسرے باشندگانِ حرم کے تجارتی قافلے برابر شام جایا آیا کرتے تھے اور وہ بہرحال یثرب و مدینہ سے گذرا کرتے تھے۔ ان تجارتی تعلقات نے ان کو اہلِ یثرب اور اوس و خزرج سے بالخصوص روشناس کرایا تھا اور ان کے درمیان سماجی تعلقات استوار کیے تھے اور یہ تعلقات قدیم، زمانۂ دراز سے قائم، مسلسل اور دوامی تھے جو ہر

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۲۹ - ۲۳۰

[2] ابن ہشام/۲/۲۲۴ - ۲۲۵

[3] ابن سعد ۱/۱۶۱

دور میں جاری ساری رہے۔

## دوسرے اکابرِ مکہ مدینہ کے تعلقات

خاندانِ بنی عبد مناف کے حوالے سے مکہ اور مدینہ کے قدیم معاشرتی تعلقات کے جائزے و تجزیے ہی سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حرمین شریفین کے دوسرے اکابر و شیوخ اور عوام کے روابط یقیناً رہے تھے۔ اور نہ صرف عہدِ اسلامی میں بلکہ عہدِ جاہلی میں بھی۔ وجوہ و عناصر اور اسباب و عوامل پر پہلے ہی بحث آ چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ شامی تجارت کے لیے مدینہ منورہ سے گذرنا اور اس کا ایک منزل و قیام گاہ ہونا اکابرِ قریش و مکہ کو اہلِ مدینہ سے جوڑتا تھا اور مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی موجودگی کے سبب ہر وقت زائرین اور حاجیوں کا آنا مدینہ والوں اور دوسرے عربوں کو مکہ و اکابرِ حرم سے وابستہ کرتا تھا۔ تیسرا عامل یہ بھی تھا کہ خاندانِ بنی عبد مناف کے خونگوار تعلقات و روابط نے بھی دوسروں کو مدینہ و مکہ والوں سے تعلقات جوڑنے اور استوار کرنے اور انھیں قائم و دائم رکھنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ اگرچہ روایات میں ان کا حوالہ کم کم آتا ہے۔ یہ ابھی تحقیق طلب موضوع ہے اور اس میں وقت بھی درکار ہے لیکن سرِ دست چند حوالے ہی کافی ہوں گے۔

۱۔ ان میں غالباً سب سے مشہور و معروف روایت مدینہ کے حضرت سعد بن معاذ اوسی اور مکہ و قریش کے سردار امیہ بن خلف جمحی کے درمیان تعلق و محبت کے بارے میں ہے۔ دونوں اپنے قبیلوں کے سردار تھے: حضرت سعد بن معاذ اوس کے شیخ تھے اور امیہ بن خلف جمحی بنو جمح کے بزرگ اور سید ہونے کے علاوہ اکابرِ قریش و مکہ میں بھی ممتاز و سرخیل تھا۔ امام بخاری کی روایت میں ہے کہ سعد بن معاذ نے بیان کیا (اور وہ امیہ بن خلف کے دوست تھے) کہ امیہ بن خلف جب مدینہ سے گذرتا تھا تو حضرت سعد کے ہاں مہمان ہوتا اور حضرت سعد جب مکہ سے گذرتے تو امیہ کے گھر اترتے تھے[1]

---

[1] کتاب المغازی، باب ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یقتل ببدر؛ فتح الباری ۷/۱۵۱، ۳۵۳

روایت میں آگے ہے کہ "ہجرتِ نبوی کے بعد سعد رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے کے لیے مکہ آئے تو امیہ کے ہاں ٹھہرے اور امیہ سے کہا کہ مجھے کسی خالی وقت میں طواف بیت اللہ کے لیے لے چلو۔ لہٰذا امیہ جمحی ان کو نصف النہار کے وقت لے چلا تو راستہ میں ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے امیہ سے اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھا تو وہ پھٹ پڑا کہ تم نے گمراہوں کو پناہ دے رکھی ہے اور تم ان کی امداد و اعانت کر رہے ہو کیا تم امن و سکون سے مکہ میں طواف کر سکتے ہو؟ اللہ کی قسم اگر تم ابوصفوان کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر والوں کے پاس صحیح سالم نہ لوٹتے حضرت سعد اوسی نے بلند آواز سے فرمایا: اللہ کی قسم اگر مجھ کو اس سے روکو گے تو ہم تم کو اس سے زیادہ سخت چیز سے ضرور ہی روک کر رہیں گے اور وہ ہے تمہارا مدینہ کا راستہ۔ امیہ نے بہرحال بیچ بچاؤ کرایا اور حضرت سعد نے امیہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید سنائی کہ وہ اس کو قتل کرنے والے ہیں۔ اس پر وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ مکہ سے نکلتا نہ تھا اور غزوۂ بدر میں بھی جانا نہیں چاہتا تھا مگر اسے ابوجہل جیسے لوگ زبردستی لے گئے اور وہاں وہ نبوی پیشگوئی کے مطابق قتل ہوا[1]

اس روایت میں بعض اہم نکات ہیں جن کو مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت سعد بن معاذ اوسی اور امیہ بن خلف جمحی دونوں قدیم دوست تھے اور دونوں مکہ مدینہ میں ایک دوسرے کے مہمان بنتے تھے۔

۲۔ یہ دوستی اور تعلق و ربط عہدِ جاہلی سے تھا اور برابر قائم رہا، اسلام اور ہجرت دونوں نے اس کو متاثر نہ کیا۔ مکی عہدِ نبوی کے تیرہ برسوں میں وہ دونوں مکہ و مدینہ آتے جاتے رہے اور ایک دوسرے کے گھر میں مہمان ہوتے رہے

۳۔ اسلام کے بعد بھی دونوں کی دوستی برقرار رہی اور ہجرتِ نبوی کے بعد بھی۔ حضرت سعد اوسی نے غزوۂ بدر سے قبل مکہ میں عمرہ کرنے کے لیے آنے کے بعد امیہ جمحی کے ساتھ ہی قیام کیا اور اسی کی رہنمائی میں عمرہ و طواف کے لیے گئے۔

۴۔ ابوجہل مخزومی نے اہلِ مدینہ کے لیے طواف و عمرہ اور حج بند کرنے کی

---

[1] فتح الباری، مذکورہ بالا۔ بخاری مذکورہ بالا۔

دھمکی دی اور اس کے ردّعمل اور جواب میں حضرت سعد اوسی نے قریش و اہلِ مکہ کے لیے مکہ سے مدینہ جانے والے راستے کو بند کرنے کی وعید سنائی۔

۵۔ یہ دراصل ان کی مدنی اور شامی تجارت کو بند کر دینے کی دھمکی تھی جیسا کہ تمام اہلِ حدیث و سیر نے بیان کیا ہے۔

مدینہ منورہ کے دوسرے رئیس اعظم اور قبیلہ خزرج کے شیخ اکبر حضرت سعد بن عبادہ بخاری خزرجی مکہ مکرمہ کے شیخ اور خاندانِ بنی عبد مناف کے ایک سید مطعم بن عدی نوفلی قریشی کے دوست تھے، اور مکہ مکرمہ سے ان کا تعلق خاصا قدیم تھا۔ ۶۲۱ء میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس و خزرج کے بارہ نقیب مقرر فرمائے اور ان سے یکے بعد دیگرے بیعت وفا و عہد لی۔ مدنی نقباء اور بیعت کرنے والے واپس ہوئے تو مشرکینِ مکہ کو کچھ سن گن مل گئی اور انھوں نے مدنی مسلمانوں کے تعاقب میں ایک دستہ بھیجا اور وہ اتفاق سے حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کو ہی پکڑ سکا۔ انھوں نے تصدیق کر لی کہ وہ دینِ محمدی کے پیرو بن چکے ہیں تو ان کو رسی سے باندھ کر مکہ لے گئے۔ تا آنکہ مطعم بن عدی نے ان کی گلوخلاصی کرائی کہ وہ ان کے دوست تھے[1] حضرت حسان بن ثابت خزرجی نے اس واقعہ پر ضرار بن خطاب فہری شاعرِ مکہ کے احسان گنانے اور جتانے کا جواب دیا تھا اور وہ اشعار ان کے دیوان میں موجود ہیں[2]

ابن اسحاق نے ایک بہت اہم روایت نقل کی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ بعض قریشی خواتین مدنی افراد سے منسوب تھیں اور ان کے اوسی یا خزرجی شوہر اور دوسرے رشتہ دار قریش اور اہلِ مکہ سے بہت قریبی روابطِ مودّت رکھتے تھے۔ حضرت ابوقیس بن الاسلت بنو واقف/اوس کے ایک اہم فرد اور شاعر تھے۔ ان کے والد کا اصل نام عامر تھا اور ان کا صیفی تھا، یعنی صیفی بن عامر واقفی اوسی۔ بلاذری نے کبیر

---

[1] بلاذری ۱/۲۵۴

[2] دیوان حسان بحوالہ بلاذری ۱/۲۵۵؛ ابن ہشام، ۳۰۲۔۳۰۳؛ سہیلی ۱/۲۷۹؛ حاشیہ مرتب بلاذری محمد حمید اللہ ۱/۲۵۵ نیز معجم البلدان، خیبر۔

ابو احیحہ سعید بن العاص اموی کی شان میں ان کے قصیدہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں[1] وہ قریش سے محبت رکھتے تھے اور ان کے داماد تھے۔ ان کے حبالۂ عقد میں ارنب بنت اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی تھیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مدتوں (برسوں) قریش کے پاس سکونت پذیر رہا کرتے تھے اور وقفہ وقفہ سے مدینہ منورہ جایا کرتے تھے[2]

اصابہ میں ہے کہ وہ ابوقیس کی کنیت سے زیادہ مشہور ہیں اور وہ نہ صرف خود مکہ منتقل ہوئے تھے بلکہ ان کے بھائی وحوح بھی نقل وطن کر کے وہاں بس گئے تھے۔ دونوں قریش کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے۔ روایت کے مطابق وہ مکہ مکرمہ میں ہی فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ ایک ضعیف روایت ہے کہ مسلمان نہیں ہوئے تھے[3]

مکہ مکرمہ اور قریش کے اسی رئیس اکبر امیہ بن خلف جمحی کے بہت عمدہ تعلقات ایک بدری صحابی جلیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری سے تھے۔ وہ دونوں قدیم دوست تھے اور ان کے تجارتی واقتصادی مفادات بھی ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن کا پرانا نام "عبد عمرو" بدل کر نیا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا تو امیہ جمحی ان کو عبدالاِلٰہ کہا کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن کہنے سے گریز کرتا کہ رحمٰن اس کے نزدیک غیر معروف نام الٰہی تھا جیسا کہ قرآن میں بھی ہے[4]

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ نام کی یہ تبدیلی مکہ میں ہوئی تھی اور ان دونوں دوستوں کی ملاقات ہوتی تو وہ "عبد عمرو" کہہ کر پکارتا اور کہتا کہ میں عمرو کو نہیں جانتا۔ حضرت عبدالرحمٰن اسے جواب نہ دیتے تو آخر اس نے تجویز رکھی کہ اگر پرانے اور پہلے نام سے

---

[1] بلاذری ۱/۱۴۱-۱۴۲

[2] ابن ہشام ۱/۳۰۰ ومابعد؛ سہیلی ۳/۱۰۷ ومابعد؛ اصابہ ۴/۱۰۷، اسد الغابہ، صفی۔ استیعاب، صفی۔

[3] اصابہ ۵/۲۷۸-۲۷۹

[4] واذا قیل لہم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن... الفرقان ۶۰۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے؟ نیز تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان مذکورہ بالا: ای لا نعرف الرحمٰن وکان ینکرون ان یسمی اللہ باسمہ الرحمٰن ۳/۳۲۳

جواب نہیں دیتے تو کوئی ایسا نام بتاؤ جس کو میں بھی قبول کروں، لہٰذا دونوں دوستوں نے اس پر سمجھوتہ کرلیا کہ وہ حضرت عبدالرحمٰن کو عبداللہ کہا کرے۔ وہ جب بھی ملتا اسی نئے اسلامی نام سے انھیں پکارتا اور وہ جواب دیتے اور اس کے ساتھ بات چیت کیا کرتے تھے۔[1]

امام بخاری نے اپنی اس روایت میں بعض اضافے بھی پیش کیے ہیں جو سماجی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے کہ میں نے امیہ بن خلف سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ مکہ میں میرے اہل و مال کی رعایت سے میرا تحفظ کرے گا اور اس کے مال و اہل اور جان کی حفاظت میں مدینہ میں کروں گا۔[2] امام بخاری نے جس عنوان کے تحت اس واقعہ کو نقل کیا ہے اسی سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کا فقہی اور قانونی پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی حربی شخص سے دارالحرب میں وکیل بنانے کا معاہدہ کرے یا دارالاسلام میں اسے وکیل بنائے تو جائز ہے۔ بعض اہل قلم نے اس معاہدۂ حفظ و امان کو ہجرتِ مدینہ کے بعد ہونا بتایا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ امام بخاری کے ترجمۃ الباب سے بھی واضح ہوتا ہے اور قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ یہ باہمی محافظت اور باہمی مفادات کے تحفظ کا معاہدہ ہجرتِ مدینہ سے قبل ہوا تھا اور روایت کے باقی حصہ کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن زہری نے اسی کے تحت جنگِ بدر کے موقع پر امیہ بن خلف جمحی اور اس کے بیٹے علی بن امیہ جمحی کو اپنی امان میں لے لیا تھا اور امیہ نے ان کو فدیہ کی موٹی رقم کا یقین بھی دلایا تھا لیکن حضرت بلال حبشی اور ان کے انصاری دوستوں کے مومنانہ جوش کے سامنے وہ امیہ اور اس کے بیٹے کی جان نہیں بچا سکے۔

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۷۱-۲۷۲؛ کان امیہ بن خلف لی صدیقا بمکۃ.... ؛ سہیلی ۵/۱۰۹-۱۱۰ و مابعد؛ بلاذری ۱/۱۹۱- طبری ۲/۴۵۱ بحوالہ ابن اسحاق۔

[2] بخاری، کتاب الوکالۃ، باب اذ وکل المسلم حربیًا فی دارالحرب او فی دارالاسلام جاز؛ فتح الباری ۴/۶۰۴-۶۰۵۔

# مدنی افراد کی سکونتِ مکہ

حرمین شریفین کے روابط وتعلقات کی ایک نوعیت ان کے بعض افراد و طبقات کا ہجرت سے قبل نقلِ وطن کرکے دوسرے شہر میں جا بسنا ہے۔ احادیث و سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مدنی افراد نے اپنا وطن چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور وہ قریش کے حلیف بن گئے تھے تاہم انھوں نے اپنے وطن اور افرادِ خاندان وقبیلہ سے سماجی اور خاندانی تعلقات منقطع نہیں کئے تھے۔ ان کی آمد ورفت بھی جاری تھی اور ان کے سبب دوسرے افرادِ مکہ و مدینہ کے تعلقات بھی ایک دوسرے سے استوار ہوئے تھے۔

ایسے ہی ایک فرد حضرت عمرو بن عوف انصاری تھے۔ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق وہ مہاجرین میں سے تھے، کہتے ہیں کہ اہلِ مغازی کے نزدیک یہی معروف ہے کیونکہ وہ عامر بن لوی/قریش کے حلیف تھے۔ اس بنا پر ان کو اہلِ مکہ میں سمجھا جاتا ہے۔ ابن اسحاق میں ان کا نام عمرو بن عوف ہے۔ ابن سعد وغیرہ نے عمیر بن عوف بتایا ہے[1] لیکن اس کا احتمال ہے کہ وہ سچ مچ انصاری رہے ہوں یعنی اصلاً وہ اوس یا خزرج کے فرد ہوں اور مکہ میں قیام کے بعد انھوں نے بعض اہلِ مکہ سے حلف کا معاہدہ کرلیا ہو اور اس لحاظ سے وہ انصاری مہاجر بن جانے کا شرف رکھتے ہوں۔ حافظ موصوف نے اگرچہ ان کے انصاری ہونے کی روایت کو امام زہری سے روایت کرنے والے شعیب کا تفرد قرار دے کر وہم قرار دیا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ بعض انصاری یعنی اوسی اور خزرجی افراد نے مکہ میں سکونت اختیار کرلی تھی جیسا کہ آتا ہے[2]

ابن ہشام کے مطابق حضرت ذکوان مہاجر انصاری کہلاتے تھے۔ ان کا پورا

---

[1] ابن ہشام بحوالہ ابن حجر؛ ابن سعد ۳/۴۰۷

[2] فتح الباری ۶/۳۱۵؛ ۷/۴۰۰ ومابعد؛ بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ باب ۱؛ کتاب المغازی باب ۱۲۔ اصابہ ۵۹۲۷؛ اسد الغابہ، استیعاب ترجمہ عمرو بن عوف انصاری۔

نام ذکوان بن عبد قیس زرقی خزرجی تھا وہ مدنی نژاد تھے اور مکہ میں بس گئے ۔ وہاں ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے اور مدتوں مقیم رہے پھر اپنے قدیم وطن مدینہ کو ہجرت کی ۔ اس لیے وہ مہاجر انصاری کہلاتے تھے[1] بیعت عقبہ کے شرکا کی فہرست میں حضرت ذکوان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ چلے گئے تھے اور آپ کے ساتھ مکہ میں رہے اس لیے ان کو مہاجری انصاری کہا جاتا تھا ۔

ابن اسحاق کی ایک روایت میں ایک اور مہاجری انصاری کا ذکر ملتا ہے اور وہ ہیں حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ سالمی خزرجی ۔ ان کا تعلق مدینہ کے قبیلہ خزرج کے بنو سالم بن عوف سے تھا ۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سکونت پذیر ہونے کے لیے مکہ چلے گئے تھے اور وہاں آپ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ تک مقیم رہے[2]

اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت عباس بن عبادہ خزرجی سالمی کے علاوہ کئی حضرات تھے جنھوں نے اسلام کی خاطر اپنا وطن ۔ یثرب ۔ ترک کر کے مکہ کی سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں ہجرتِ مدینہ تک قیام پذیر رہے اور ہجرتِ مدینہ نہ ہوتی تو وہیں مقیم رہتے اور جب ہوئی تو واپس اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے وطن مدینہ لوٹے ۔ حضرت ذکوان بن عبد قیس زرقی خزرجی اس جماعت مہاجران مدنی کے دوسرے فرد اور رکن تھے لیکن یہی دو حضرات نہیں تھے ۔ روایت کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ متعدد حضرات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور و پیغام سن کر مدینہ / یثرب سے مکہ گئے اور پھر اسلام قبول کر کے وہیں کے ہو رہے ۔ ابھی یہ گرہ کھلنی باقی ہے کہ ان دو یثربیوں کے علاوہ اور کون لوگ تھے اور وہ کب مکہ مکرمہ جا کر مقیم ہوئے تھے ؟

اسی فہرستِ شرکاءِ بیعتِ عقبہ میں ایک تیسرا نام حضرت عقبہ بن وہب غطفانی

---

[1] ابن ہشام ۲/ ۸۰ مع حاشیہ ۱ مرتب ؛ ۲/ ۶۹

[2] ابن ہشام ۲/ ۷۲-۷۳ ؛

کا تھا۔ وہ اصلاً قیس عیلان کے ایک فرد تھے لیکن یثرب کے قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنو سالم بن غنم بن عوف بن خزرج کے حلیف بن گئے تھے۔ یہ خزرجی شاخ بنو المبلیٰ کے نام سے معروف تھی۔ وہ بدری صحابی ہیں اور ان یثربی مہاجروں میں شامل ہیں جو مدینہ سے مکہ کو ہجرت کر کے گئے تھے اور وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام و نصرت کی سعادت حاصل کرنے والوں میں شامل تھے اور دہرے لقب مہاجری انصاری سے سرفراز تھے[1]

## قریشی افراد کی اقامتِ مدینہ

عہدِ جاہلی میں اور اسلامی دور میں ہجرت سے قبل بعض مکی افراد کے ترکِ وطن کر کے مدینہ میں سکونت کا امکان ہے۔ اور روایات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ یہ نقلِ مکانی مختلف اسباب سے ہوتا تھا۔ ان میں خاندان سے اختلاف و نزاع، مدینہ والوں سے سماجی ربط و تعلق، ازدواجی تعلقات اور تجارتی معاملات وغیرہ اہم ترین عناصر و عوامل معلوم ہوتے ہیں۔ قریشی اور مکی افراد اپنے نقلِ وطن کے باوجود اپنے افرادِ خاندان اور شہر سے برابر رشتہ استوار رکھتے تھے اور دونوں کی ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت بھی ہوتی تھی۔

قریشِ مکہ کے مدینہ منتقل ہونے والے افراد میں ایک اہم شخصیت عتبہ بن ابی وقاص زہری کی تھی جو مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کے برادر اصغر تھے۔ وہ ہجرتِ مدینہ سے قبل کسی وقت مدینہ جا بسے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں سے، بالخصوص اپنے برادرِ اکبر حضرت سعد بن ابی وقاص زہری سے تعلق قائم رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے بھائی کو اپنا وصی بھی بنایا اور ایک باندی کے فرزند کے باب میں ان کو وصیت کی تھی۔ بعد میں وہ اسلام بھی لے آئے تھے اور قبلِ ہجرت وفات پائی تھی[2] امام بخاری کی روایت میں وضاحت ہے کہ زمعہ

---

[1] ابن ہشام ۲/۷۳؛ اسد الغابہ ۳/۴۲۱-۴۲۲ [2] اسد الغابہ، ترجمہ عتبہ بن ابی وقاص؛ بخاری، کتاب البیوع، باب تفسیر المشبہات؛ باب شراء الملوک الخ فتح الباری ۴/۳۷۰-۳۷۲؛ ۵۱۹-۵۲۱۔

کی دختر کے فرزند عتبہ کی اولاد تھے لہٰذا ان کو وصیت کی کہ ان کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ لیکن وہ عبد بن زمعہ کے والد زمعہ کے بستر اور گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فیصلہ کیا تو عبد بن زمعہ کا بھائی قرار دے کر ان کی تحویل میں دے دیا اور حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کے دعوے کو مسترد کر دیا کہ قانون یہی کہتا تھا لیکن چونکہ بچے میں عتبہ سے مشابہت پائی جاتی تھی، لہٰذا ام المومنین حضرت سودا کو جو عبد بن زمعہ کی بہن تھیں اور مولود کی پھوپھی بھی، ان سے پردے کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔ کیونکہ وہ اصلاً عتبہ بن ابی وقاص زہری کے فرزند تھے جو ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ کے لیے غیر محرم تھے اور ان کے فرزند بھی۔

## مکہ و مدینہ کے مذہبی تعلقات

عرب قبیلے اوس اور خزرج عمرہ و حج اور زیارت کے لیے مکہ مکرمہ آتے تھے اور قریش مکہ کو خانۂ کعبہ کے متولی و پاسدار کی حیثیت سے اپنا دینی رہنما سمجھتے تھے۔ قریش کے بعض دینی اکابر ان کے لیے بھی مذہبی تقدس رکھتے تھے۔ ان دونوں مقدس شہروں کے باشندوں کی دینی زندگی اور مذہبی مفاہمت کی ایک اور جہت بھی تھی جو خاصی اہم تھی۔ دین ابراہیمی کے پیرو ہونے اور ابراہیم علیہ السلام کے وارث و امین ہونے کے باوجود قریشِ مکہ یہود مدینہ کے مذہبی تفوق سے مرعوب تھے اور ان کے دین کو اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ دینی اور فکری معاملات میں وہ علمائے یہود سے رجوع کیا کرتے تھے۔

قریش مکہ کے درمیان رواجی مذہب سے بیزاری اور بغاوت کا رجحان پیدا ہوا تو ایک طبقہ تو حنیفیت کی طرف گیا۔ وہ اپنے رواجی طور و طریقوں کو اور مشرکانہ رسوم و اعمال کو ترک کر کے صحیح مذہب براہیمی کی تلاش میں لگ گیا۔ اسی کو حنیفیت کی تحریک بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کے ماننے والوں کو احناف (حنیف کی جمع) قرار دیا گیا۔ اس کے سب سے بڑے علمبردار حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی تھے جو سچے حنیف رہے اور آخر وقت تک اسی پر جمے رہے۔ احناف میں سے بعض نے تلاشِ حق اور جستجوئے دین کی خاطر نصرانیت میں پناہ لی

اور اسی کو صحیح ترین دین و مذہب سمجھا۔ حضرت ورقہ بن نوفل اسدی، عثمان بن حویرث اور عبید اللہ بن جحش اسدی خزیمی نے حنیفیت کو چھوڑا اور نصرانی بن گئے۔ موخر الذکر دونوں کی موت نصرانیت پر ہوئی جب کہ حضرت ورقہ بن نوفل اسدی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر کے مسلم بن گئے۔

بعض دانشورانِ مکہ اور حکماء قریش اپنے رواجی دینِ براہیمی پر قائم رہے، مگر علمائے یہود و نصاریٰ کی صحبت، تعلیم و تربیت اور ان سے استفادے کی بنا پر مذہبی اور دینی شخصیات اور فکری اصحاب میں اپنا مقام بنالیا۔ اکابر قریش میں نضر بن حارث عبدری ان کا فکری قائد، دینی مباحث، مذہبی مناظر اور جدل و جدالِ عقلی کا امام خاص تھا۔ اس کو صاحب احادیث کہا جاتا تھا اور اس نے ایرانیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور نصاریٰ و یہود کی صحبت پائی تھی[۱]۔ قرآن مجید کی فکری اساس اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی ربانی سے سرفرازی پر وہ طرح طرح کے حملے کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی کہانیوں اور قصوں اور دوسری احادیث کو قرآنی آیات جیسا بلکہ ان سے بہتر بتاتا تھا اور فکری پرچار کرتا تھا[۲]۔

سیرت نگاروں اور تاریخ و تفسیر دانوں سے متعدد آیاتِ قرآنی کی تنزیل میں اسی نضر بن حارث عبدری کو "وجوہ" میں گنایا ہے۔

مذہبی و فکری سوچ بچار اور یہودیت و نصرانیت سے اس کے موازنے کا ایک نمونہ حنیفِ مکہ حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی کے سلسلے میں نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایک سفرِ شام کے دوران تلاشِ حق میں گئے تھے۔ ان کو یہودیت و نصرانیت سے طبعی اجتناب تھا۔ اتفاق سے وہاں ایک راہب سے ملاقات ہوئی جس نے ان کو اصل دینِ ابراہیمی کی تلاش پر اکسایا، کیونکہ حضرت ابراہیم کا دین ہی اصل دین ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی نہ تھے۔ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی تھی اور اسی کو اصل دینِ براہیمی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ

---

[۱] بلاذری ۱/۱۳۹ [۲] ابن ہشام ۱/۳۱۵، ۳۱۹، ۳۲۰-۳۲۷؛ ۲/۹۳، ۲۵۶، ۲۸۵ - ۲۸۶، ۳۱۱، ۳۵۷ وغیرہ؛ بلاذری ۱/۱۳۹-۱۴۱ و مابعد

حنیفیت ہے اور وہی سچے رسول ہیں[1] مکہ مکرمہ میں یہودی علماء کی بشارتوں کا بھی برابر ذکر ملتا ہے اور ان کے فکری دھارے کا بھی[2]

اسلام کی حقانیت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق تو قریشِ مکہ کے دل کرتے تھے لیکن انھوں نے فکری طور سے زچ کرنے اور آزمائش کے ذریعہ اصل بات کا پتہ لگانے کے لیے اپنے دو بڑے نمائندوں نضر بن حارث عبدری اور عقبہ بن ابی معیط اموی کو علمائے یہود کے پاس مدینہ منورہ بھیجا تھا تاکہ وہ ایسے سوالات و علامات معلوم کرکے آئیں کہ تصدیق کی جاسکے علماء یہودِ مدینہ سے اکابرِ قریش کے مذہبی استفسارات صرف اس بنا پر تھے کہ یہود کو وحی الٰہی کا امین اور اپنے مذہب سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ انھوں نے علماء یہودِ مدینہ سے روح، اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں سوالات سیکھے تھے اور رسولِ اکرم سے ان کو پوچھا تھا اور آپؐ نے ان کے صحیح صحیح جواب دے کر ان کو ناطقہ سربگریباں اور اپنی صداقت ثابت کر دی تھی[3] یہ واقعہ اگرچہ زمانی لحاظ سے ذرا بعد کا ہے لیکن یہ وضاحت کرتا ہے کہ قریشِ مکہ کے یہودِ مدینہ سے مذہبی روابط قدیم زمانے سے تھے۔

## بحث کا نقطۂ ارتکاز

حرمین شریفین — یعنی مکہ و یثرب اور مکہ و مدینہ — کے گوناگوں سماجی تعلقات کی واضح شہادت کے بعد ہمارے قدیم و جدید سیرت نگاروں کا یہ تاثر کتنا سطحی نظر آتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیغامِ اسلام کا پتہ اہلِ یثرب کو مکی عہدِ نبوی کے بالکل اواخر میں لگ سکا۔ وہاں اسلام کا تعارف اور اس کی اشاعت کا سلسلہ ۱۱ نبوی/۶۲۰ء کے لگ بھگ ہو سکا۔ ہمارے تمام سیرت نگار — قدیم و جدید — متضاد رویہ اپناتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ

---

[1] ابن سعد ۱/۱۶۲ [2] ابن سعد ۱/۱۶۲—۱۶۳

[3] ابن ہشام ۱/۳۲۰ - ۳۳۵؛ ابن سعد ۱/۱۶۵؛ بلاذری ۱/۱۴۲۔

اس حقیقت کے قائل ہیں کہ دونوں شہروں میں قدیم روابط تھے اور دوسری طرف وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تخم ریزی یثرب میں ان چھ خزرجی اکابر کے قبولِ اسلام اور توسیع و تبلیغِ دین سے ہوئی جو ۶۲۰ء میں اچانک اسلام اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہوئے اور مسلمان ہوئے اور مدینہ میں اسلام کی تبلیغ کا باعث بنے۔ ان سے پہلے وہ سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ ادسی کے اسلام سے متاثر ہونے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے کا ذکر بھی بطورِ مثال اور برائے بیت کر دیتے ہیں۔ ان کو قبولِ اسلام کا لمحہ نہیں گردانتے، بلکہ چھ خزرجیوں کو ہی ابتدائے قبولِ اسلام کا شرف دیتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ یثرب تک اسلام کا پیغام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف ان ہی کے ذریعہ پہونچا [1]

یہ جائزہ بھی غلط ہے اور اس سے کشید کر کے یہ تاثر دینا کہ یثرب میں اسلام کا یہ اولین واقعہ تھا بھی غلط ہے، اگرچہ مولانا مودودی جیسے اہلِ قلم نے یثرب کے بزرگوں۔ ابو الہیثم بن التیہان اور ذکوان بن عبد قیس اور اسعد بن زرارہ کے ان سے پہلے قبولِ اسلام کا ذکر بھی کیا ہے۔ اصلاً تمام سیرت نگاروں نے

---

[1] شبلی ۱/۲۶۰-۲۶۲ مع حاشیہ ۲: ان کے واقعۂ قبول اسلام کا عنوان ....."ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے"۔ ادریس کاندھلوی (۱/۳۳۱) نے چھ خزرجیوں کے قبولِ اسلام کے واقعہ کی سرخی لگائی ہے: "مدینہ منورہ میں اسلام کی ابتدا، سنہ نبوی"۔ مودودی، سیرت ۲/۶۹۱-۶۹۳ وما بعد: کی عنوانی سرخی ہے: "انصار کے اولین گروہ کا قبولِ اسلام اور پہلی بیعتِ عقبہ....."۔ منصور پوری (۱/۷۶) "اسبابِ ہجرت" کی سرخی کے تحت سنہ نبوی کے موسم حج میں چھ خزرجیوں سے یثرب میں اسلام کا تعارف مانتے ہیں۔ علی ندوی، السیرۃ النبویۃ، ۱۵۲: "بدء اسلام الانصار"؛ وخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الموسم... اذ لقی رھطا من الخزرج.... مبارکپوری، ۲۰۹-۲۱۶ وما بعد: ... یہ یثرب کے چھ جوان تھے .... جب یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے ... وہاں گھر گھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا پھیل گیا، ان کے علاوہ متعدد بلکہ بہت سے مؤلفینِ سیرت نے یہی تاثر دیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا اور اسلام کا تعارف سنہ ۱۱ نبوی یا ۶۲۰ء میں ہی مدینہ منورہ کے اوس و خزرج میں پھیل گیا۔ حالانکہ وہ اس سے قبل کے بعض واقعاتِ قبولِ اسلام کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

قدیم مؤلفینِ سیرت بالخصوص ابن اسحاق و ابن ہشام کی روایات کی کورانہ تقلید میں تحلیل و تجزیہ کی راہ نہیں اپنائی اور یثرب میں تبلیغ اسلام و تعارفِ رسول کا ذکر اسی لمحۂ زمان میں کیا جو ان کے مصادر و مآخذ میں موجود تھا۔ حالانکہ بہت سی دوسری روایات اس واقعۂ عظیم کی تاریخ کافی پہلے لے جاتی ہیں۔ یہ ایک طویل، تحقیق طلب بحث ہے جو بعد میں ایک علٰحدہ مقالے میں پیش کی جائے گی۔ یہاں قدیم ترین دستیاب سیرت نبوی کے قابل اعتماد دفتر کی ایک اہم روایت نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے کہ وہ صحیح تناظر پیش کرتی ہے۔

ابن اسحاق ہی کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ عرب میں پھیلا اور شہروں تک پہونچا تو آپؐ کا ذکرِ خیر مدینہ میں بھی ہوا اور عربوں کا کوئی خاندان (حی) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ سے اوس و خزرج سے زیادہ واقف نہ تھا جب آپ کا ذکرِ نبوت ہوا یا اس کے ذکر سے قبل بھی یہی معاملہ تھا، کیونکہ وہ یہودی علماء سے سنا کرتے تھے اور وہ ان کے حلیف تھے اور ان کے ساتھ ان کے دیار میں رہتے تھے۔ جب مدینہ میں آپؐ کا ذکرِ خیر ہوا تو انھوں نے قریش کے درمیان واقع ہونے والے اختلاف پر بھی بات چیت کی اور اس پر چرچا کرتے رہے[1]۔ ابن اسحاق کی روایات کے درولبست سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعذیبِ جسمانی سے قبل کا واقعہ ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علانیہ دعوتِ اسلامی کے کچھ دنوں کے بعد ہی مدینہ منورہ میں آپ کا پیغام متعارف ہو چکا تھا اور اہلِ یثرب آپ کے نئے مشن سے واقف ہو چکے تھے۔ قدیم تعلقات کا حوالہ ابن اسحاق کے اس بیان میں نہیں ہے مگر وہ بہر حال مضمر ہے، کہ آپ اور آپ کے خاندان سے وہ بخوبی واقف تھے اور ان ہی تعلقات نے یثرب میں اسلام کی آبیاری کی۔

---

[1] ابن ہشام ۱/ ۲۹۹ - ۳۰۰؛ سہیلی ۴/ ۶۸ - ۶۹ و مابعد؛

# شاہ ولی اللہؒ اور مولانا آزادؒ کی تفسیروں کا تقابلی مطالعہ

(۲)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

## اسرائیلیات

قرآن کی تفسیر و تشریح میں اسرائیلی روایات سے مدد لی جائے یا نہیں اور اگر لی جائے تو کس حد تک؟ یہ مسئلہ مفسرین کی توجہ کا موضوع رہا ہے، اگرچہ اسرائیلی روایات سے استفادہ کی حمایت شاید ہی کسی مفسر نے کی ہو مگر یہ بھی برحق ہے کہ کم ہی مفسرین کا دامن اسرائیلیات سے پاک رہا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے ذہن میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب، اس قاعدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ جب تک تعریض کلام اللہ کا بیان حدیثِ نبویؐ میں دستیاب ہو سکے بنی اسرائیل سے نقل نہ کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ ضروری امر اپنی حد تک ہی محدود رہتا ہے، اس لیے اقتضاء تعریض کی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہیے تاکہ اس کی تصدیق ہم قرآنی شہادت سے کر سکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے۔"[۵۶]

مولانا آزاد اس کلیہ سے بھرپور اتفاق کرتے ہیں اور تفسیری اصولوں کی تفہیم کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

"نومسلم اقوام کے قصص و روایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے، ان میں سے اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص و خرافات)

کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی اثرات دُور دُور تک سرایت کر چکے تھے اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے۔"[۵۷]

تفسیروں میں اسرائیلی روایات کی دراندازی کا شکوہ جو مولانا نے کیا ہے وہ درست ہے اور مولانا نے ایسی روایات سے ترجمان القرآن کو دور رکھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مولانا نے جس فراخ دلی کے ساتھ بائبل یعنی توریت اور انجیل سے استفادہ کیا ہے اور قرآنی مطالب کی گرہ کشائی میں ان سے استشہاد کیا ہے وہ بجائے خود قابلِ غور مسئلہ ہے چنانچہ سورہ الانبیاء کی آیت وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء:۸۳) کی تفسیر میں مولانا آزاد نے پورا انحصار توریت کے باب ایوب پر کیا ہے اور پورے باب کا خلاصہ تقریباً ۶ صفحات میں بلا تکلف نقل کیا ہے۔[۵۸]

مفسرینِ سلف نہ صرف اسرائیلی روایات کے سلسلے میں محتاط تھے بلکہ توریت و انجیل سے استشہاد کرنے میں بھی محتاط تھے۔ مگر بعد کے مفسرین میں بائبل سے اخذ و استفادہ اور قرآن کی تفسیر میں اس سے استشہاد کا رجحان پیدا ہوا جس کو اسرائیلیات کی دوسری شکل ہی کہا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے بائبل کا مطالعہ بار بار کیا ہے اور ترجمان القرآن میں بکثرت اس کے بیانات کا حوالہ دیا ہے حالانکہ مولانا آزاد کی رائے توریت کے بارے میں یہ ہے کہ:

> "توریت کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ ہی کہا جائے، لیکن موجودہ زمانہ میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتابِ پیدائش لائقِ اعتماد نہیں، خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ"۔[۵۹]

ایسے موقع پر معتدل و متوازن طرزِ عمل وہی ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ نے اشارہ کیا ہے۔

## شاہ ولی اللہؒ اور مولانا آزادؒ کی تفسیروں میں فرق

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کی تفسیروں میں جہاں ہم آہنگی کی مثالیں ملتی ہیں وہاں فرق و اختلاف کی مثالیں بھی موجود ہیں اور یہ فرق متعدد وجوہ اور پہلو رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اور مولانا ابو الکلام آزاد کے طریقۂ تفسیر میں ایک فرق یہ ہے کہ شاہ صاحب

آیات کی تفسیر کرتے ہوئے بالعموم نزول کے پس منظر، حالات، مسائل اور اسباب پر نظر رکھتے ہیں جبکہ مولانا آزاد آیات کے مطالب، آفاقی پیغام منطقی نتائج اور عمومی اثرات کو اجاگر کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ آیت دیکھئے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا (النساء:۵۸) — خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس کی تفسیر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"اس آیت میں اشارہ ہے عثمان حجبی کے واقعہ کی طرف کہ ان کے ہاتھ سے خانہ کعبہ کی چابی لے لی گئی اور لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چابی حاصل کرنے کی سعی کی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہ کیا اور حضرت عثمان حجبی کو دوبارہ چابی سونپ دی۔"[۵۶۰]

مولانا آزاد نے اس موقع پر لکھا ہے۔

"اجتماعی زندگی کے نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حق دار ہو اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالہ کر دو، وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو قرض دار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو، کوئی چیز ہو اور کوئی صورت ہو لیکن جو جس کا حق ہے اور جو جس کا اہل ہے وہ اسے ملنا چاہیے۔"[۵۶۱]

سورہ توبہ میں اہل کتاب سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں ارشاد ہے حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبہ: ۲۹) شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے "تا آنکہ بدہند جزیہ از دست خود خوار شدگان"[۵۶۲]

مسلمانوں سے زکوٰۃ و صدقات لینا اور مفتوح اہل کتاب سے جزیہ لینا برحق ہے، مگر "وہم صاغرون" کا ترجمہ شاہ صاحب نے "خوار شدگان" کیا ہے جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بعض فقہاء نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل ذمہ سے جزیہ لینے کے ساتھ انہیں خاص طرح کے لباس کا پابند بنایا جائے گا اور انہیں

گھوڑے کی سواری استعمال کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہی رجحان شاہ صاحب کے ترجمہ سے بھی جھلکتا ہے۔ حالانکہ یہ تصور ہی انسانوں سے حسن سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی عام قرآنی تعلیمات سے بالکل متصادم ہے۔ صاغرون کا ترجمہ چھوٹا بن کر رہنا یا اسلام کی بالادستی قبول کرنا بھی ہوسکتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا طور پر اس حقیقت کو محسوس کیا ہے اور اسلام کے قانونِ جزیہ کی حکمت تفصیل سے بیان کی ہے مولانا آزاد نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے "یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کریں اور حالت ایسی ہوجائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو۔"[۶۳]

یہ ترجمہ عام ترجموں سے مختلف ہے، اس لیے حواشی میں اسے مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تصریح کی ہے" سمعت عددا من اھل العلم یقول الصغار ان یجری علیھم حکم الاسلام "

یعنی میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ وہم صاغرون کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہوجائیں۔ یعنی وہ اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جھک جائیں۔"[۶۴]

یہی مطلب زیادہ مناسب اور قرآن کی مجموعی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔

## یوسفؑ کے بھائیوں کا جھوٹ

سورۂ یوسف میں ایک موقع کا بیان ہے کہ جب قحط کے ایام میں یوسفؑ کے بھائی غلّہ لینے آئے تو حضرت یوسفؑ نے اپنے حقیقی بھائی بنیامن کے سامان میں پیالہ رکھ دیا۔ جب کارندوں نے اسے تلاش کیا تو وہ بنیامن کے سامان میں سے نکلا۔ اس پر ان کے سوتیلے بھائیوں نے کہا۔

اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ (یوسف: ۷۷)

شاہ ولی اللہ نے یوسف کے بھائیوں کے اس قول کو امرِ واقعہ تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یوسف علیہ السلام نے (بچپن میں) اپنی نانی کے یہاں ایک سونے کا بت چرا لیا تھا تاکہ وہ بت پرستی سے باز رہیں یا اس قصہ کے مشابہ کوئی چیز چرائی تھی جو ان پر تہمت کا سبب بنی"۔ ۶۵ھ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایسے کسی واقعہ کی صحت سے انکار کیا ہے اور حضرت یوسف کے بھائیوں کے اس قول کو جھوٹ اور حسد پر محمول کیا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کی توجیہ زیادہ مناسب اور برمحل ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جھوٹوں کا قاعدہ ہے کہ کوئی موقع، کوئی بات ہو جھوٹ بولنے سے نہیں رکتے، اگر مدح کا موقع ہو تو جھوٹی مدح کر دیں گے، مذمت کا موقع ہو تو کوئی جھوٹا الزام لگا دیں گے، جب بنیامن کی خرجی میں سے پیالہ نکل آیا تو بھائیوں کا سوتیلے پن کا حسد جوش میں آگیا، جھٹ بول اٹھے "اگر اس نے چوری کی تو کوئی عجب بات نہیں، اس کا بھائی یوسف بھی چور تھا"، پس یہ بغض و حسد کی ایک بات تھی، اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ واقعی کوئی ایسی بات ہوئی بھی تھی"۔ ۶۶ھ

## اہلِ کتاب محمدؐ کی رسالت کو پہچانتے تھے

سورہ الانعام میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (الانعام: ۲۰)

شاہ ولی اللہ نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے "انانکہ ایشاں را کتاب دادہ ایم می شناسند حقیقت قول را یعنی کلمۂ توحید" ۶۷ھ گویا یعرفونہ سے مراد توحید ہے یعنی اہلِ کتاب اپنی اولاد کی طرح توحید کی معرفت رکھتے تھے۔ جبکہ مولانا آزاد نے یعرفونہ سے مراد محمدؐ کی رسالت لی ہے اور یہی عام مفسرین کا خیال ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی یہود اور نصاریٰ وہ حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں ہیں وہ اس کی سچائی یعنی پیغمبر اسلام کی سچائی اس طرح پہچان گئے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں"۔ ۶۸ھ

## واقعاتِ انبیاء کی توجیہ

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کے تفسیری مناہج میں فرق و امتیاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب نے انبیاء کرام سے متعلق واقعات کی تشریح و توجیہ فتح الرحمان میں روایتی انداز میں کی ہے جبکہ مولانا آزاد نے بالعموم عقلی اور اجتہادی انداز اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر:

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے مجھے دکھا دے، اللہ نے پوچھا کیا تمہیں ہماری قدرت پر ایمان نہیں؟ ابراہیمؑ نے کہا ایمان تو ہے مگر اطمینانِ قلب چاہتا ہوں تب اللہ نے ارشاد فرمایا:

"فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا (البقرہ: ۲۶۰)

شاہ ولی اللہ نے وہی ترجمہ کیا ہے جو عام طور پر مفسرین کرتے ہیں یعنی "بگیر چہار عدد از پرندگان پس بہم آور ہمہ را نزدیک خود قطعہ قطعہ بعد ازاں بگذار بر ہر کوہے از ایشاں بعد ازاں ندا کن ایشاں را بیایند پیش تو شتاباں" شاہ صاحب نے ترجمہ میں "قطعہ قطعہ" کا اضافہ کیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ پرندوں کے ٹکڑے کیے جائیں، دیگر مفسرین نے اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ ذبح کر کے ان کے ٹکڑے کر کے ان کے پارچے ملا لیے جائیں، پھر ان کو پہاڑوں پر رکھا جائے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں مطالبۂ ابراہیم میں حیات سے مراد دعوتِ حق سے مردہ قوموں کا زندہ ہو جانا ہے، نہ کہ حقیقی موت و حیات۔ مولانا لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا، جبکہ ان کے ملک میں اور ان کے ملک سے باہر کوئی گروہ بھی ایسا نہ تھا جس میں قبولِ حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو، یہ حالت دیکھ کر انھوں نے کہا خدایا تو کیوں کر اس موت کو زندگی سے بدل دے گا؟ اس پر اللہ نے دعوتِ حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی مثال سے واضح کر دی، اگر تم ایک پرند کو کچھ دنوں تک اپنے پاس رکھ کر ایسا

تربیت یافتہ بنا سکتے ہو کہ تمہاری آواز سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتا ہوا آجا سکتا ہے تو گمراہ اور متوحش انسان دعوت کی تفہیم و تربیت سے اس درجہ اثر پذیر نہیں ہو سکتے کہ تمہاری صدائیں سنیں اور ان کا جواب دیں"۔[۶۹]

مولانا آزاد کی یہ تفسیر دور از کار معلوم ہوتی ہے، ایک جلیل القدر نبی اللہ سے یہ مطالبہ کیوں کرے گا کہ تو شرک سے ایمان کی طرف لوگوں کو کس طرح لائے گا جب کہ نبی کو مبعوث اسی کام کے لیے کیا گیا ہے۔ ہاں وہ اگر مردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا مطالبہ قابل فہم ہے اور یہ ویسا ہی مطالبہ ہے جو ایک دوسرے نبی نے اللہ سے کیا تھا جس کا تذکرہ پہلے کی آیت اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا میں موجود ہے۔

سورہ الانبیاء: ۷۸ میں ہے:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ

شاہ صاحب نے اس آیت کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ:

"ایک گروہ کی بکریاں دوسرے گروہ کے کھیت میں رات کے وقت گھس کر کھیت چر گئیں حضرت داؤد نے بکریاں کھیت والے کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کیا اور حضرت سلیمانؑ نے بکری والے کو کھیت کی کاشت درست کرنے اور اس وقت تک کھیت والے کے لیے بکریوں کا دودھ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا"۔[۷۰]

مولانا آزاد نے آیت کے اس مفہوم کا اگرچہ انکار نہیں کیا ہے، مگر ترجمہ اور تشریح میں ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اگر ایک آدمی ایک طرف کھیت بوئے، دوسری طرف رات کے وقت اپنی بکریاں بھی کھول دیا کرے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ یہی کہ ساری فصل تباہ ہو جائے گی، وہ جتنا چر سکیں گی چریں گی جتنا روند سکیں گی روند جائیں گی۔ یہی حال یہودیوں کا تھا، وہ ایک طرف بناتے تھے، دوسری طرف خود اپنے ہی ہاتھوں اسے اجاڑ دیتے

تھے حضرت داؤدؑ نے انھیں فلسطینیوں پر فتح مند کرایا اور تمام ملک ساحلِ بحر تک ان کے قبضہ میں آگیا لیکن پھر بھی ان میں نظم و اطاعت کی روح پیدا نہ ہوئی، البتہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا اور انھوں نے اپنی دانش و حکمت و نبوت سے یہودیوں کی حالت ایسی پلٹ دی کہ ایک عظیم الشان عبرانی مملکت قائم ہوگئی۔"[۱۰]

## خواتین کے حقوق

ہر مصنف اپنے زمانے کے علمی شعور، تہذیبی و تمدنی سرگرمیوں اور سماجی تبدیلی کا کسی نہ کسی درجہ میں اثر قبول کرتا ہے اور اس کی علمی کاوشوں میں اس کی جھلک کم و بیش نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد اور شاہ صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس لیے ان بزرگوں کی تفسیری کاوشوں کی معنویت اور قدر و قیمت کا تجزیہ کرتے وقت ان دونوں کے عہد اور علمی، سیاسی اور سماجی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کی دونوں ترجمانی کرتے ہیں مگر دونوں الگ رخ اور جہت پر زور دیتے ہیں، وقت اور حالات نوکِ قلم کو خود بخود اپنی طرف موڑ لیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے عہد کا مسلم معاشرہ جامد و ساکن اور مولانا آزاد کا ماحول گوناگوں علمی ترقیوں اور سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا ہے۔ نئے علوم و افکار اور تجربوں کا ہے، اس کا انعکاس ان کی تفسیری کاوشوں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ملاحظہ ہو:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ: ۲۲۸)

شاہ صاحب نے اس آیت کا سادہ سا معروف مطلب بیان کیا ہے "زنان را بر مرداں حق است چنانچہ مردان را بر زناں حق است"[۱۱]

جب کہ مولانا آزاد نے یہاں ایک تفصیلی بحث حقوقِ نسواں پر کی ہے تاریخ میں عورت کا مقام، مذاہب کا ان کے بارے میں رویّہ اور اسلام کے عطا کردہ حقوق پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، وہ لکھتے ہیں "قرآن نے چار لفظ کہہ کر "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے

انقلاب کا اعلان کر دیا تھا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کا حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا، ان لفظوں نے اسے محرومی و شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و مساوات کے تخت پر بٹھا دیا۔ پھر اسلوبِ بیان کی جامعیت اور مانعیت پر غور کرو، زندگی و معاشرت کی کون سی بات ہے جو ان چار لفظوں میں نہیں آگئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں کر دیا گیا"[۳۷]

اسی کے بالمقابل سورۃ النساء کی آیت ہے" اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۳۴)

شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں عورتوں پر مرد کے نگراں ہونے کا سبب مرد کی فطری اور جبلّی برتری بیان کیا ہے ان کے الفاظ ہیں" بسبب آنکہ مراں در اصلِ جبلت برتر انداز زناں"[۳۸]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مرد عورتوں کے لیے کارفرما ہوئے، اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لیے کہ مرد اپنا مال جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ یعنی خاندانی زندگی کا نظام قائم نہیں ہو سکتا اگر کوئی فرد اس کا قوام یعنی بندوبست کرنے والا نہ ہو، یہ "قوام" ہستی کس کی ہوئی؟ شوہر کی یا بیوی کی؟ قرآن کہتا ہے خاندانی زندگی کا نظام اس طرح چل رہا ہے کہ قوام ہستی کی جگہ شوہر کی ہوئی۔ پس اتنا ہی امتیاز ہے جو مرد کو عورت کے مقابلہ میں حاصل ہے، بشرطیکہ اس امتیازی ذمہ داری کو جو سرتاسر ایک بوجھ ہے وجہ امتیاز حاصل کر لیا جائے ظاہر ہے کہ اس امتیاز سے مردوں کو کوئی پیدائشی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا محض خاندانی نظام کا ایک ڈھنگ ہے جس نے یہ جگہ اسے دلا دی ہے"۔[۳۹]

مولانا آزاد کی مذکورہ دونوں وضاحتوں پر غور کیجئے، اور پھر اس عہد کو دیکھئے جب یورپ میں آزادئ نسواں کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی، زندگی کے ہر میدان میں مساواتِ مرد و زن کے آوازے بلند ہو رہے تھے اور اس کی بازگشت نہ صرف

اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور میں سنائی دیتی تھی بلکہ مسلم ممالک بالخصوص مصر میں مسلم دانشوروں کی تحریروں اور تحریکوں میں اس کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسی پس منظر میں مولانا آزاد نے مصری مصنف فرید وجدی کی کتاب "المرأۃ المسلمہ" کا اردو ترجمہ کیا۔ یہی ذہنی پس منظر ہے جس میں انھوں نے حقوق نسواں کے سلسلہ میں قرآن کریم کی آیتوں کی حکمت و عہد حاضر میں ان کی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں زیادہ مفصل بحث سورہ یوسف کی آیت "اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ" کے تشریحی نوٹ میں کی ہے۔

## جدید علمی تحقیقات

شاہ ولی اللہ اور مولانا آزاد کے مناہج تفسیر میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب کی تشریح کی بنیاد قدیم علوم و معارف پر ہے کیوں کہ علوم جدیدہ یا نئی تحقیقات ان کے عہد میں سامنے نہ آئی تھیں۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد کو وہ دور ملا جس میں تازہ معلومات، جدید تحقیقات اور اثری انکشافات سامنے آرہے تھے اور ان سے قرآنی واقعات کو سمجھنے میں مدد مل رہی تھی۔ مولانا آزاد کی اس جدید مواد پر نظر بھی تھی اور قرآن کریم کی ترجمانی میں انھوں نے اس کا پورا استعمال بھی کیا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

> "علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیم کی جاتی ہے، لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں"۔[۶]

## اصحاب رقیم

ماحول اور عہد کی وجہ سے قدیم و جدید کا یہ فرق فتح الرحمان اور ترجمان القرآن میں بھی نظر آتا ہے۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کو اصحاب رقیم بھی کہا گیا ہے۔

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (الکہف: ۹)

شاہ صاحب اور دیگر مفسرین نے رقیم کا مطلب، تحریر، اور مکتوب بیان کیا ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ "نوشتہ کہ دیوار غار"[۵۳] مگر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ رقیم ایک شہر کا نام تھا جس میں یہ غار واقع تھا، مولانا آزاد نے اس تشریح کو جدید اثری تحقیقات Archeology کی مدد سے تفصیل مدلل کیا ہے۔ مولانا آزاد کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا، اس لیے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے ہیں کہ یہاں رقیم کے معنی کتاب کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا، اس لیے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں راقیم کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا، اور عرب اسے بطرا کہنے لگے۔

عالم گیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک "پیٹرا" بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کیے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔[۵۴]

یہاں ضمناً اس بات کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا کہ مولانا مودودی نے مولانا آزاد کی اس تحقیق سے اختلاف کیا ہے۔ وہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جدید زمانہ کے محققین آثار قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ مزید فرماتے ہیں ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی)

## علم جنین

رحم مادر میں بچہ کی تخلیق سے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا

الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (المومنون: ۱۴)

اس آیت میں "خَلْقًا آخَرَ" کی تشریح شاہ صاحب نے کی ہے 'روح پھونکنا اور ناخن اور بال کا اگنا'۔[۷۹]

مولانا ابوالکلام آزاد نے رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل پر علم جنین کی جدید تحقیقات کی مدد سے سیر حاصل بحث کی ہے، وہ مذکور تشریح کے بارے میں کہتے ہیں:

"چوں کہ مراتبِ پیدائش کی کوئی ایسی انقلابی حالت ہمارے مفسّرین کے سامنے نہ تھی اس لیے قدرتی طور پر اس کی کوئی جمتی ہوئی تفسیر ان سے بن نہ آئی اور مختلف وادیوں میں نکل گئے، بعضوں نے کہا: اس سے مقصود نفخِ روح کی حالت ہے، کیوں کہ اس مرتبے سے پہلے روح نہیں ہوتی، بعضوں نے کہا یہ شکمِ مادر سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ وضعِ حمل اسی کے بعد ہوتا ہے، بعضوں نے کہا: مقصود بالوں کا پیدا ہونا ہے، اس سے پہلے بال نہیں ہوتے۔"[۸۰]

مولانا آزاد ایسی تمام توجیہات کی جو قدیم اور جدید مفسرین نے کی ہیں کمی بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اگر اس مقام کی تشریح و تحقیق کا حق ادا نہ ہو سکا تو اسے مفسّروں کے قصورِ فہم پر محمول نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس باب میں وہ یقیناً معذور تھے۔ علم و تحقیق کا یہ گوشہ تمام تر زمانہ حال کی پیداوار ہے اور زمانۂ حال میں بھی سب سے آخری عہد کی پیداوار۔ انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ جو علوم جدیدہ کے انکشاف و تکمیل کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ ہے، پورا گزر گیا اور کارخانۂ فطرت کے اس گوشۂ مستور کے تمام حجاب نہ اٹھ سکے۔ پس اگر اٹھارہویں صدی کے حکما معذور تصوّر کیے جا سکتے ہیں کہ اس بارے میں بالکل غلط رخ پر جا رہے تھے حالانکہ خوردبین ایجاد ہو چکی تھی اور انسانی نفس کی تشریح کا بابِ مسدود کھل چکا تھا تو ظاہر ہے نویں اور دسویں صدی کے مفسرینِ قرآن کیوں نہ معذور تصوّر

کیے جائیں"۔[۸۱]

بلاشبہ مولانا آزاد نے نئی علمی تحقیقات سے جو استفادہ کیا ہے اور تشریح آیت میں ان سے جو مدد ملی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے، مگر ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا انیسویں صدی کی تحقیقات کے سامنے آنے سے پہلے جملہ مفسرین آیت کا مفہوم نہ سمجھ سکے؟ اور یہ پورے ایک ہزار سال کا طویل زمانہ آیتِ الٰہی کا صحیح مفہوم سمجھنے والے علماء و مفسرین سے خالی رہا؟

## شاہ صاحب پر تنقید

مولانا ابوالکلام آزادؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے متاثر ضرور ہیں مگر ان کے مقلد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاہ صاحب کے بہت سے تفسیری خیالات سے نہ صرف اختلاف کرتے ہیں، بلکہ ان پر برملا تنقید کرتے ہیں، اگرچہ اس تنقید میں عمومی لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں، صراحۃً شاہ صاحب کا نام نہیں لیتے۔ مثلاً

## حق اور ہدایت

سورہ یونس کی آیت ہے قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ (یونس: ۳۵)

بگو آیا ہست از شریکان شما کسے کہ راہ نماید بسوئے دین حق۔ بگو خداست کہ راہ نماید بسوئے حق لائق تر است بانکہ پیروی کردہ شود یا کسے کہ خود راہ نمی یابد مگر اں وقت کہ راہ نمودہ شود۔[۸۲]

دیگر مفسرین نے بھی بالعموم ہدایت سے ہدایتِ الٰہی اور حق سے دینِ حق مراد لیا ہے۔ جبکہ مولانا آزاد کے نزدیک "یہاں ہدایت سے مقصود وحی نہیں ہے بلکہ وجدان و حواس اور عقل کی ہدایت ہے اور حق سے مقصود دینِ حق نہیں ہے بلکہ لغوی معنی یعنی سچا راستہ، درست راستہ"۔[۸۳]

مولانا آزاد ان مفسرین پر سخت تنقید کرتے ہیں جو یہاں ہدایت سے مراد

ہدایتِ وحی اور حق سے مراد دینِ حق لیتے ہیں اور وہ اس تفسیر کو ان مفسرین کا قصورِ فہم سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ مقام قرآن کے مہمّاتِ دلائل میں سے ہے اور ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے، چونکہ اس آیت میں ہدایت اور حق کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے مفسرین نے خیال کیا کہ ہدایت سے مقصود ہدایتِ وحی ہے اور حق سے مقصود دینِ حق۔ اور فارسی و اردو کے تمام مترجموں نے بھی انھیں کی پیروی کی، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے استدلال کی ساری حقیقت مفقود ہوگئی اور آیت کا مطلب بھی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اس طرح تمام مقامات دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ متاخرین کا معیارِ نظر و مطالعہ کیوں اس درجہ پست ہوگیا تھا کہ قرآن کے صاف و صریح مطالب سے بھی آشنا نہ ہوسکے"۔[۸۴]

## سامری کی گوسالہ پرستی

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی پکار پر گئے اور اپنی قوم کی نگرانی حضرت ہارونؑ کے سپرد کی تو اس عرصہ میں سامری نے ایک بچھڑا بنا کر پوری قوم کو اس کی پرستش کی دعوت دی۔ سفر سے واپسی پر موسیٰؑ نے سامری سے جواب طلب کیا تو انھوں نے کہا۔

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (طٰہٰ: ۹۶)

شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ و مطلب یہ بیان کیا ہے:

"میں نے وہ چیز دیکھی جو سارے لوگوں نے نہیں دیکھی، پس میں نے ایک مٹھی مٹی جبریل کے نقشِ قدم سے اٹھائی اور اسے ڈال دیا، اسی طرح میرے نفس نے میرے سامنے پیش کیا"۔

تشریح میں شاہ صاحب نے یہ اضافہ کیا ہے یعنی اس ڈھانچہ میں ڈال دیا جو گوسالہ کی شکل میں سونے کا بنایا تھا"۔[۸۵]

مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے :

"میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی اس لیے اللہ کے رسول (موسیٰؑ) کی پیروی میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا تھا، پھر چھوڑ دی (کیا کہوں) میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سُجھائی ۔"[۸۶]

مولانا آزاد نے تشریح میں ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جنھوں نے رسول سے مراد فرشتہ اور قبضۃ من اثر الرسول کا مطلب فرشتہ کے نقشِ قدم کی مٹی لی ہے ۔ اور اسے یہود کی کہانی قرار دیا ہے ۔ مولانا لکھتے ہیں :

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی تفسیر کی روایتوں میں بھی شامل ہوگئی اور اثر الرسول کا مطلب یہ بنالیا کہ "جبریل کے نقشِ قدم" کی ایک مشت خاک سامری نے اٹھالی تھی، لیکن یاد رہے کہ یہ تفسیر کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوسکتی، اتنا ہی نہیں بلکہ ایسی تفسیر کرنا قرآن کے اس مقام کو تمسخر انگیز حد تک بے معنی بنا دینا ہے"[۸۷]

مولانا آزاد نے اس کو تفصیلی دلائل سے ثابت کرنے کی سعی کی ہے ۔

## الساعۃ کا مفہوم

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ (الحجر: ۸۵)

شاہ صاحب نے اس آیت میں "الساعۃ" کا ترجمہ قیامت کیا ہے ۔ مگر مولانا آزاد نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

"قرآن میں الساعۃ کا لفظ کہیں تو روزِ قیامت کے لیے بولا گیا ہے ۔ کہیں ایک ایسے فیصلہ کن دن کے لیے جو دعوتِ حق اور اس کے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کردے گا، اس آیت میں "الساعۃ" سے مقصود ایسا ہی دن ہے، قیامت کا دن نہیں جیسا کہ اکثر مفسّروں اور مترجموں نے قرار دیا ہے ۔"[۸۸]

## شاہ صاحب کا امتیاز

بعض مقامات پر صاف محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی معنی آفرینی کی کوششوں کے باوجود آیت کی تشریح شاہ صاحب کی تفسیر سے فروتر ہے۔

قصۂ یوسف میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کو قید سے نکالنے کے لیے بادشاہ کا ایلچی آتا ہے تو حضرت یوسف قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ اپنے آقا سے ان عورتوں کی سرگزشت پوچھو جنھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ یوسف معصوم ہیں۔ تب عزیزِ مصر کی بیوی نے اقرار کر لیا کہ آج سچی بات ظاہر ہو گئی، ہاں میں نے یوسف کو پھسلایا تھا اور وہ راست باز تھا۔ اس منظر کے بعد دو آیتیں ہیں۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۲-۵۳)

مولانا آزاد نے ان دونوں آیتوں کا ترجمہ کیا ہے:

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اسے معلوم ہو جائے (یعنی یوسف کو معلوم ہو جائے) کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی نیز اس لیے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی ابھارنے والا ہے (اس کے غلبہ سے بچنا آسان نہیں) مگر ہاں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔" [۸۹]

شاہ ولی اللہ نے مذکورہ دونوں آیتوں کو زوجۂ مصر کے بجائے حضرت یوسفؑ کا قول بتایا ہے اور اس آیت سے کلام کو جوڑا ہے جس میں حضرت یوسف نے بادشاہِ مصر سے کہا ہے کہ ان عورتوں سے میرے جرمِ بے گناہی کی تفصیل معلوم کریں

جس کے الزام میں مجھے قید کی سزا دی گئی، جب تک وہ الزام رفع نہ ہو جائے میں قید خانہ سے نہیں جاؤں گا۔ اور اگلی دو آیتیں اسی قول کی وضاحت حکمت اور عظمت کی شہادت کے لیے ہیں۔" (گفت یوسف) ایں ہمہ برائے انست تا بداند عزیز کہ من خیانت او نکردم غائبانہ و بداند کہ خدا راہ نمی نماید خیانت کنندگان"۔[۹۰] یہی معنی عام طور پر مفسرین نے لیا ہے۔

مولانا آزاد نے محض کلام کے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے مذکورہ دونوں آیتوں کو ماقبل کی آیت کا حاصل بنا دیا، اگرچہ اس سلسلہ میں ان کے پیش رو ابن تیمیہ اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین ہیں، مگر موقعِ کلام کی نزاکت اور واقعہ کی داخلی شہادت مولانا آزاد کی ترجمانی کو کمزور اور شاہ صاحب کی ترجمانی کو مضبوط ثابت کرتی ہے۔

عزیزِ مصر کی بیوی کیسے کہہ سکتی ہے کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ اس کی خیانت نہیں کی۔ اس سے بڑی خیانت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک پاک نفس نوجوان کا دامنِ عصمت داغ دار کرنے کی سعی کی۔ پھر اس پر جھوٹا الزام لگایا اور پھر اپنے اثرات کا استعمال کر کے قید و بند کی سزا دلا دی۔ پھر وہ کس منہ سے کہہ سکتی تھی کہ میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتی جبکہ بے شرمی، شہوت پرستی اور غرور کے سارے مظاہرے کر ڈالے۔ یہ دونوں باتیں صرف حضرت یوسفؑ کی عصمت و عظمت کی تصویر کشی کرتی ہیں اور انہی کو زیب دیتی ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے الزام کی از سرِ نو تحقیقات اس لیے کرائی کہ عزیزِ مصر کو معلوم ہو جائے کہ جس نوجوان کو انھوں نے بیٹے کی طرح عزت و احترام سے گھر میں رکھا تھا اس نے اس کے غائبانہ میں کوئی خیانت نہیں کی پھر یہ کہ میں انسان ہوں اور انسان کے ساتھ اس کا نفس لگا رہتا ہے، مگر میرے ساتھ میرے رب کی مہربانی رہی جو ہر نازک مرحلہ میں میری رہنمائی کرتی رہی۔ یہ آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کا خوبصورت اعتراف اور اظہار ہے۔ ایسے بلند اور پاکیزہ کلام کا کہنے والا وہی ہو سکتا ہے جس کا کردار بھی پاکیزہ اور بلند رہا ہو اور وہ حضرت یوسف ہیں نہ کہ عزیزِ مصر کی بیوی۔

## مولانا آزاد کا امتیاز

بعض مقامات پر مولانا آزاد کا ترجمہ و تشریح شاہ صاحب کے مقابلہ میں زیادہ

معنی خیز اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے لیے دیکھیے:

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ (المائدہ: ۵)

اس آیت کا مولانا آزاد نے ترجمہ کیا ہے۔

"آج (کہ دینِ حق اپنے ظہور میں کامل ہوگیا ہے) تمام اچھی چیزیں تم پر حلال کر دی گئی ہیں (جو بے جا قیدیں لوگوں نے لگا رکھی تھیں سب دور ہوگئیں) ان لوگوں کا کھانا جنھیں کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے"۔ ۹۱ھ

اس جگہ شاہ صاحب ایک دوسرا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"یعنی جو کچھ اہل کتاب کے لیے حلال تھا وہ تمہارے لیے بھی حلال ہے مثلاً گائے اور بکری اور جو کچھ تمہارے لیے حلال کیا گیا مثلاً اونٹ اور ناخون والے جانور وہ ان لوگوں کے لیے بھی حلال ہے جو ان لوگوں میں سے ایمان لائے اور یہود و نصاریٰ کے قبیلوں کا اس باب میں اعتبار نہیں"۔ ۹۲ھ

مولانا آزاد کی تشریح جمہور مفسرین سے ہم آہنگ اور زیادہ معنویت کی حامل ہے، جبکہ شاہ ولی اللہ کی تشریح میں نکتہ آفرینی تو بے شک ہے مگر اقتضاء کلام دوسرا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام لانے کے بعد پچھلی تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں اور اسلام لانے والا کسی بھی رنگ و نسل یا فرقہ و مذہب سے ہو اس پر وہی احکام نافذ ہوتے اور اس کے وہی حقوق ہوتے ہیں جو عام مسلمانوں کے ہوتے ہیں، اس میں اہلِ کتاب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اب اس جملہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی کہ تمہارا کھانا ان کے لیے اور ان کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ آیت کی معنویت تو اس وقت روشن ہوتی ہے جب یہ کہا جائے کہ مشرکانہ و ملحدانہ مذہب کے مقابلہ میں یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں جن کا کھانا یعنی ذبیحہ تمہارے لیے حلال کیا گیا ہے، کیونکہ اسی آیت میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

آخر میں شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ کا فرق و امتیاز سمجھنے کے لیے چند آیتوں کے تراجم کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، اہلِ نظر ان کا محاکمہ خود کر سکتے ہیں۔

| آیات | فتح الرحمٰن | ترجمان القرآن |
|---|---|---|
| (۱) وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ (الاعراف: ۱۶۵) | وگرفتار کردیم ستم کاراں را بعذاب سخت | شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا۔ |
| (۲) وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (یوسف: ۹) | تا باشید بعد ازیں گروہے شائستہ (یعنی توبہ کنید) | اور اس کے (یوسف کے) نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھر جائیں۔ |
| (۳) قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (مریم-۲۴) | پیدا کردہ است پروردگار تو پائیں تو جوئے (چشمہ) | تیرے پروردگار نے تیرے تلے ایک بڑی ہستی پیدا کر دی ہے۔ |
| (۴) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر: ۴) | وجامہائے خود را پاک ساز | اور اپنے قلب کو پاکیزہ رکھو۔ |

## حواشی

۵۶ الفوز الکبیر ص ۷۸
۵۷ ترجمان القرآن ۱/۳۸، دیباچہ
۵۸ ایضاً ۴/۷۱۷ تا ۷۲۳
۵۹ ترجمان القرآن ۳/۷۱۷
۶۰ فتح الرحمٰن، النساء - ۵۸
۶۱ ترجمان القرآن ۲/۴۷۹
۶۲ فتح الرحمٰن، التوبہ - ۲۹
۶۳ ترجمان القرآن ۳/۲۶۱
۶۴ ایضاً ۸۹۲ حواشی
۶۵ فتح الرحمٰن، یوسف - ۷۷ حاشیہ
۶۶ ترجمان القرآن ۲/۱۱
۶۷ فتح الرحمٰن، الانعام - ۲۰
۶۸ ترجمان القرآن ۲/۱۱
۶۹ ایضاً ص ۲۳۹
۷۰ فتح الرحمٰن، الانبیاء - ۷۸
۷۱ ترجمان القرآن ۴/۴۰۹
۷۲ فتح الرحمٰن، البقرہ ۲۲۸
۷۳ ترجمان القرآن ۲/۱۸۹
۷۴ فتح الرحمٰن، النساء - ۳۴
۷۵ ترجمان القرآن ۲/۱۹۰
۷۶ ایضاً ۱/۵۲ دیباچہ
۷۷ فتح الرحمٰن، الکہف - ۹
۷۸ ترجمان القرآن ۴/۴۰۶
۷۹ فتح الرحمٰن، المؤمنون - ۱۴
۸۰ ترجمان القرآن ۴/۹۲۸
۸۱ ایضاً ص ۹۲۹
۸۲ فتح الرحمٰن، یونس - ۳۵
۸۳ ترجمان القرآن ۳/۵۸۷
۸۴ ایضاً ص ۵۸۵
۸۵ فتح الرحمٰن، طٰہٰ - ۹۶
۸۶ ترجمان القرآن ۴/۶۳۴
۸۷ ایضاً ص ۶۶۷
۸۸ ایضاً ص ۱۲۲
۸۹ ایضاً ۳/۶۵-۷۶۴
۹۰ فتح الرحمٰن، یوسف - ۵۲
۹۱ ترجمان القرآن ۲/۵۹۳
۹۲ فتح الرحمٰن، المائدہ - ۵

# اسلام کا نظامِ وراثت

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

زندگی کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مرنے والے کے مال وجائداد کی تقسیم یعنی وراثت کا ہے۔ اس مسئلہ میں انسانیت ہمیشہ افراط وتفریط میں مبتلا رہی ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ میں بھی ایک حیرت انگیز اور عدل وانصاف پر مبنی قانون اور لائحۂ عمل پیش کیا ہے۔ وراثت کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر بیان کرنے سے پہلے دیگر مذاہب اور قوموں کے نظریہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ تقابل میں آسانی ہو۔ یقین ہے کہ اس سے اسلامی شریعت کا اعتدال اور توازن نمایاں ہوگا۔

## یہودیت میں قوانین وراثت

یہودیوں کے یہاں وراثت کا حق دار صرف لڑکا ہوتا ہے، اس کی موجودگی میں نہ تو میّت کے والدین کا کوئی حصہ ہے اور نہ بیٹی کا، بیوی اور شوہر کا اور دیگر رشتے داروں کا بھی کوئی حصہ نہیں ہے، بیوہ اور بیٹیاں اولادِ نرینہ کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں، البتہ لڑکی اگر نابالغ ہو تو بارہ سال کی عمر تک وہ باپ کے ترکہ میں سے اپنا خرچہ لے سکتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ بیوہ بہرصورت میراث سے محروم ہوتی ہے اور ایک بوجھ سمجھی جاتی ہے:

لڑکا ہر حالت میں میراث کا حق دار ہوتا ہے چاہے وہ نکاح کے ذریعہ وجود میں آیا ہو یا بدکاری کا نتیجہ ہو، نیز سب سے بڑا لڑکا خواہ وہ بدی کا نطفہ ہو دوگنا حصہ پاتا ہے۔

بیٹے، پوتے وغیرہ کی غیر موجودگی میں لڑکیاں میراث پاتی ہیں اور وہ نہ ہوں تو

ان کی اولاد' اور لڑکے، لڑکیاں، پوتے، نواسے وغیرہ نہ ہوں تو ترکے کا مستحق باپ ہوتا ہے، اور اس کی غیر موجودگی میں دادا' اور اس کے بعد بھائی، چچا وغیرہ،

کسی یہودی عورت کا انتقال ہو اور کوئی اولاد نہ ہو تو شوہر اس کا وارث ہوتا ہے۔

اولادِ نرینہ کے ہوتے ہوئے اسے کسی بھی طرح کی وصیت کا حق نہیں ہے اور وارث لڑکیاں ہوں تو جسے چاہے اور جتنا چاہے وصیت کر سکتا ہے۔

کوئی بت پرست یہودی مذہب اختیار کر لے تو اس کی وفات کے بعد غیر یہودی رشتہ دار اس کے وارث نہ ہوں گے، البتہ کوئی بت پرست وفات کر جائے تو یہودی اس کا وارث ہوگا اور اگر کوئی یہودی بت پرست وغیرہ ہو جائے تو یہ اپنے یہودی رشتہ داروں کے ترکہ سے محروم ہوگا، اور یہودی رشتہ دار اس کے وارث ہوں گے۔

## وراثت نصرانیت میں

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہی پر عامل تھے، وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں شریعتِ موسوی کو ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لیے آیا ہوں، اس لیے ظاہر ہے کہ وراثت کے سلسلہ میں مسیحیت کا بھی وہی نقطۂ نظر ہے جو اوپر تورات کے حوالے سے مذکور ہوا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کے بائیس سال بعد مسیحیت نے تورات کے تمام احکامات پر خطِ نسخ پھیر دیا۔ اس لیے اب ان کے یہاں اس پر عمل نہیں ہے، بلکہ مختلف فرقوں کے یہاں وراثت کے سلسلہ میں الگ الگ احکام ملتے ہیں، جن میں سے بیشتر احکام رومی یا یونانی قانون سے ماخوذ ہیں۔

## رومی قانونِ وراثت

رومی قانونِ وراثت میں مختلف اوقات میں متعدد تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ابتداء میں وراثت کو وصیت سے متعلق کیا گیا کہ مورث جس شخص کے لیے وصیت

کر جائے وہی اس کے تمام مال کا وارث ہوگا، یہاں تک کہ بادشاہ "غسطنیانوس" ۵۴۳ء کا دور آیا اور اس نے وراثت کی بنیاد قرابت پر رکھی، نیز قریب ترین وارث کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کو محروم قرار دیا، اور استحقاق وراثت میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، اس نے وارثوں کے مختلف طبقے قرار دیئے۔ پہلا طبقہ فروع یعنی بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان کی نسل سے اگر کوئی موجود ہے تو دوسرا وراثت کا حق دار نہ ہوگا اور ان کی غیر موجودگی میں دوسرا طبقہ یعنی اصول کے درمیان ترکہ تقسیم ہوگا۔ جن میں باپ دادا، بھائی وغیرہ شامل ہیں۔

قابل ذکر یہ ہے کہ اگر دادا کے ساتھ حقیقی بھائی موجود ہے تو وہ محروم نہ ہوگا، بلکہ برابر کا حق دار ہوگا ایسے ہی پوتا بھی محروم نہیں ہوتا ہے بلکہ دادا کے مرنے کے بعد وہ اپنے چچا کے ساتھ برابر کا حصہ دار ہوتا ہے۔

اصول و فروع اور حقیقی بھائی موجود نہ ہو تو یہ حق ماں شریک یا باپ شریک بھائی کو ملتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں دیگر رشتہ داروں میں برابر تقسیم کیا جائے گا، اس طور پر کہ قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار محروم ہوگا۔

میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کے ترکے سے مکمل طور پر محروم ہوگا کیونکہ ان کے یہاں وراثت کی بنیاد قرابت پر ہے۔

## یونانی قانون وراثت

اہل یونان کے یہاں بھی ابتداءً وراثت کو وصیت سے متعلق رکھا گیا تھا کہ انسان اپنی زندگی ہی میں کسی کے حق میں وصیت کر جائے اور اس کی موت کے بعد تمام ترکہ وصیت کردہ شخص کی طرف منتقل ہو جاتا تھا بعد میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور قرابت کو بنیاد قرار دیا گیا، تاہم اولادِ نرینہ کی موجودگی میں کسی عورت کا کوئی حصہ نہ تھا، بیٹی وغیرہ وراثت کی حق دار اس وقت ہوئی جبکہ کوئی مرد وارث موجود نہ ہو، ــــ ان میں یہ بھی رواج تھا کہ نکاح کے وقت بیٹی کو "دوملہ" (جہیز) کے نام سے گھریلو استعمال کی چیزیں دے دیا کرتے تھے، اور یہی ان کی محرومی

کا عوض ہوتا تھا۔

اولادِ نرینہ کی غیر موجودگی میں بیٹی اپنے باپ کے مال کی نگراں ہوتی تھی اور شادی کے بعد اسے کوئی لڑکا پیدا ہو جائے تو قانونی طور سے وہ مجبور تھی کہ اس لڑکے کو اپنے باپ کی طرف منسوب کرے اور ترکہ اس کے نام کر دے، گویا کہ عورت میراث کو صرف منتقل کرنے والی ہوتی ہے، وہ کسی چیز کی مالک نہیں بن سکتی۔

## ہندومت

ہندو قانونِ وراثت میں عورتوں کے لیے ترکہ میں کوئی حصہ نہیں ہے، نیز تمام چیزوں کا مالک صرف بڑا لڑکا ہوتا ہے، اور دوسرے سب محروم[1]

## قوانین وراثت مغربی ممالک میں

بعض ملکوں میں وراثت سے متعلق جو قوانین نافذ ہیں وہ یونانی اور رومی قانون کا چربہ ہیں۔ یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، جن میں اکثر و بیشتر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ فرانسیسی قانون میں میت کی اولاد، ان کی غیر موجودگی میں اس کے باپ، دادا، پھر بھائی اور چچا کو وراثت کا حق دار قرار دیا گیا تھا اور ان سب کی غیر موجودگی میں غیر قانونی لڑکا حصہ دار ہوتا ہے، بیٹے اور پوتے کی موجودگی میں باپ اور دادا محروم ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی بیٹا وفات کر جائے تو دوسرے موجودہ بیٹوں کے ساتھ پوتا بھی دادا کی میراث کا حق دار ہوتا ہے۔

جرمن قانون کے لحاظ سے وراثت کی بنیاد قرابت اور زوجیت پر ہے، فرع کی موجودگی میں زن و شو میں سے ہر ایک کا حصہ چوتھائی ہے اور فرع کے نہ ہونے کی صورت میں آدھا، اور اصول و فروع میں سے کوئی موجود نہ ہو تو شوہر پورے ترکے کا حق دار ہوتا ہے۔

انگریزی قانون میں بیٹے کے ہوتے ہوئے بیٹی محروم ہوتی ہے، نیز پہلوٹا سب

---

[1] ترجمہ تارا چند چھپر تاجر کتب لاہور

پر مقدم ہوتا ہے، اور اولاد نرینہ کی غیر موجودگی میں بیٹی وارث ہوتی ہے۔

روس میں جب کمیونزم برسر اقتدار ہوا تو شروع میں وراثت کا کوئی تصور ہی نہ تھا کہ فرد کسی چیز کا مالک نہ تھا، ہر چیز پر حکومت کی ملکیت ہوتی تھی، بعد میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں تین طرح کے لوگوں کو وارث قرار دیا گیا:

۱۔ اولاد، زوجین

۲۔ والدین اور منہ بولا بیٹا۔

۳۔ بھائی بہن۔

ان میں سے قریب ترین کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کو محروم قرار دیا گیا۔

یورپ، امریکہ اور دیگر ملکوں میں اس وقت جو قانون وراثت رائج ہے اس کا ذکر تفصیل طلب ہے۔ صرف اتنا اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ان میں رومی اور یونانی روح کارفرما ہے، گو بعض جزئیات اور تفصیلات میں اختلاف ہے۔

## وراثت کا نظام عربوں میں

اہل عرب مختلف قبیلوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں باہم آویزش اور کشمکش رہتی تھی، میدان کارزار ہمیشہ گرم رہتا تھا، اس لیے وہ تمام معاملات کو اسی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ وراثت میں ان کے یہاں چھوٹے بچوں اور عورتوں کا کوئی حصہ نہ تھا کہ یہ لوگ جنگی صلاحیتوں سے محروم تھے اور اپنے قبیلہ کی طرف سے دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے یہاں میراث پانے کے تین اسباب تھے: قرابت، ولاء، تبنّی

۱۔ **قرابت**: میراث کے اسباب میں سے قرابت ایک اہم سبب تھی، لیکن اس کے لیے شرط تھی کہ وارث بالغ اور جنگی صلاحیت کا حامل ہو، اور ترکے کا سب سے پہلا حق دار بیٹا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی اور وارث نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد پوتا، پھر باپ، دادا اور ان کے بعد بھائی اور چچا وغیرہ کا حق تھا۔

۲۔ **ولاء** - اسی جنگ و جدال کی وجہ سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ایک شخص دوسرے شخص سے مدد اور نصرت کا معاہدہ کرتا تھا جسے "ولاء" کہا

جاتا ہے اور قریبی وارث کی موجودگی میں یہ شخص وارث ہوتا تھا۔

۳۔ تبنّی: گذشتہ امتوں اور مذاہب میں لے پالک بیٹے کا رواج تھا اور اب بھی بہت سے فرقوں میں باقی ہے، کہ لوگ دوسروں کے بچے کو گود لیتے ہیں اور وہ حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا ہے اور اس کی جائداد کا وارث ہوتا ہے، عربوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا، یہاں تک کہ اسلام نے آکر اس غیر فطری طریقے کو ختم کیا۔[1]

## اسلام کا قانونِ وراثت

اب ہم تفصیل سے اسلام کا قانونِ وراثت پیش کریں گے۔

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اس کی ضیا پاش کرنوں سے زندگی کا ہر گوشہ روشن اور تابناک ہے، اس بارانِ رحمت سے حیاتِ انسانی کا ہر حصہ سیراب اور پربہار ہے، وہ پیدائش سے لے کر موت تک کے اور مرنے کے بعد کے بھی مسائل کا حل پیش کرتا ہے، ایسا حل جو عقلِ انسانی سے قریب تر اور فطرت سے ہم آہنگ ہے، اعتدال اور توازن اس کی تعلیمات کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ وراثت کے سلسلے میں بھی اس کے قوانین عدل و انصاف پر مبنی اور اعتدال و توازن سے متصف ہیں۔

## لغوی اور اصطلاحی مفہوم

"وراثت" عربی زبان میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ باقی رہنا اور ایک شخص سے دوسرے کی طرف کسی چیز کا منتقل ہونا،[2] خواہ وہ مال و جائداد ہو یا علم اور شرف و منزلت۔ شریعت کی اصطلاح میں کسی شخص کی وفات کے بعد اس کی ملکیت کو

---

[1] یہ تمام تر تفصیلات ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب "ھذا ھو الاسلام" ۱/۳۳۴ اور ابو الیقظان عطیہ کی کتاب حکم المیراث فی الشریعۃ الاسلامیہ ص ۱۱، ۲۲ سے ماخوذ ہیں۔

[2] التحقیقات المرضیہ فی المباحث الفرضیۃ، صالح بن فوزان بن عبداللہ۔ طبع جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، طبع دوم ص ۱۰

وارثوں کی طرف منتقل کرنے کا نام میراث اور وراثت ہے[۱]

اسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے ایک دوسرا لفظ "فریضہ" استعمال ہوتا ہے جس کی جمع فرائض ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ متعدد معانی کے لیے مستعمل ہے، کاٹنا، متعین کرنا، اتارنا، واضح کرنا وغیرہ[۲] اور اصطلاح میں علم الفرائض اس علم کو کہا جاتا ہے جس میں وراثت کے حق دار اور اس سے محروم ہونے والے اور وارثوں کے متعین حصے اور ان کو باہم تقسیم کرنے کے طریقے بتائے گئے ہوں[۳]

## وراثت کی اہمیت

### ۱۔ قرآن مجید

قرآن حکیم میں عام طور پر مسائل کے سلسلہ میں اجمالی احکام دئے گئے ہیں اور جزئیات و تفصیلات سے تعرض نہیں کیا گیا ہے، نماز اور زکوٰۃ جیسے بنیادی مسائل کی بھی بہت کم تفصیلات مذکور ہیں، لیکن وراثت ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی بیشتر جزئیات اور تفصیلات خود قرآن میں موجود ہیں، ہر وارث کے حصے کو متعین کر دیا گیا ہے، اور "وصیت" جیسے تاکیدی لفظ سے اس حکم کی ابتدا کی گئی ہے:

| | |
|---|---|
| يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ | تمہاری اولاد کے سلسلہ میں اللہ تم |
| لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۝ | تمہیں یہ وصیت کرتے ہیں کہ مرد کو دو |
| (النساء: ۱۱) | عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ |

نیز اسے اللہ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ، متعین کردہ حکم اور اس کی قائم کردہ حد قرار دیا گیا، اور اس حد کی پاسداری پر بڑے اجر و ثواب کا وعدہ اور اس کی خلاف ورزی پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی، ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ | یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں |
| يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ | جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت |

---

[۱] الوارث فی الشریعۃ الاسلامیہ، الشیخ محمد علی الصابونی طبع دار القلم دمشق ۱۹۹۳ء ص ۳۴

[۲] التحقیقات المرضیۃ ص ۱۰ [۳] حوالہ سابق

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝

(النساء: ۱۳-۱۴)

کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔

## ۲۔ احادیث نبوی

(۱) عن ابی هریرة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال تعلموا الفرائض و علموہ فانہ نصف العلم وھو ینسی وھو اول شیء ینتزع من امتی[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم میراث کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کہ وہ آدھا علم ہے (غفلت ہو تو آدمی اسے جلد) بھول جاتا ہے اور سب سے پہلے یہی علم میری امت سے اٹھا لیا جائے گا۔

اس حدیث سے علم الفرائض کی قدر و قیمت اور شرف و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے آدھا علم کہا گیا کہ جتنے بھی علوم ہیں اگر انھیں تقسیم کیا جائے اور ایک طرف تمام علوم اور دوسری طرف علم فرائض کو رکھ دیا جائے تو یہ ان سب کے برابر ہوگا*

---

[1] رواہ ابن ماجہ والدارقطنی والحاکم وفیہ متروک، نیل الاوطار ۶/۵۳ محمد بن علی الشوکانی، طبع مکتبۃ الدعوۃ الاسلامیہ الازہر۔

* یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے۔ اس کے ایک راوی حفص بن عمر کو محدثین نے متروک قرار دیا ہے۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو بھی اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ علم فرائض دینی علوم کا ایک حصہ ہے، اسے نصف علم کہہ کر اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نصف علم اس معنی میں کہا گیا ہو کہ احکام دین کے ایک حصہ کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے اور ایک حصہ کا تعلق مرنے کے بعد اس کے مال و جائداد سے۔

۲۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعود ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال تعلموا القرآن وعلّموہ الناس وتعلّموا الفرائض وعلّموھا فانی امرءٌ مقبوض والعلم مرفوع ویوشك ان یختلف اثنان فی الفریضۃ والمسألۃ فلا یجدان احداً یخبرھما[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ، علم میراث بھی خود سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیونکہ میں دنیا سے چلا جاؤں گا اور علم اٹھا لیا جائے گا اور عن قریب ایک ایسا دور آئے گا کہ دو آدمیوں کے درمیان فرائض کے سلسلہ میں اختلاف ہوگا اور وہ کسی ایسے کو نہیں پائیں گے جو انھیں صحیح مسئلہ بتا سکے۔

۳۔ عن عبد اللّٰہ بن عمروؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال العلم ثلاثۃ وما سوی فضل آیۃ محکمۃ او سنۃ قائمۃ او فریضۃ عادلۃ[2]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم تین چیزوں کا نام ہے اور اس کے علاوہ جو چیزیں ہیں وہ زوائد کے قبیل سے ہیں، قرآنی آیت، سنت اور عدل پر مبنی علم وراثت[*]

---

= ہے۔ (مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/۴۵۱) اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وراثت کا علم عام دینی علوم کا نصف ہے۔ (جلال الدین)

[1] رواہ النسائی والحاکم والدارقطنی وفیہ انقطاع ورواہ نفر بن شمیل وشریک متصلاً (نیل الاوطار: ۶/۵۳)

[2] رواہ ابوداؤد وابن ماجہ، فیہ راویان ضعیفان، نیل الاوطار ۶/۵۴ وصححہ السیوطی فی الجامع الصغیر ۲/۶۹

[*] 'فریضۂ عادلہ' سے بعض حضرات نے علم فرائض مراد لیا ہے جو حدیث کے مضمون سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ علم (دین) کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو کسی محکم آیت پر مبنی ہو، دوسری وہ جو سنتِ ثابتہ سے معلوم ہو۔ علم کی تیسری قسم وہ ہے جو ان دونوں سے مستنبط ہو۔ اسے فریضہ اس لیے کہا گیا کہ عمل اس پر بھی واجب ہوتا ہے۔ (جلال الدین)

ان حدیثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح سے اس علم کی اہمیت دل ودماغ میں اتارنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم محض سیکھنے اور سکھانے سے ہی باقی رہ سکتا ہے کہ اس کا دارومدار قرآنی آیت اور احادیث پر ہے، قیاس اور اجتہاد کا اس میں کوئی دخل نہیں، نیز یہ کہ ممارست نہ ہو تو آدمی اس علم کو بہت جلد بھول بھی جاتا ہے، اس لیے اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

## صحابۂ کرام کے اقوال

۱۔ عن عمر بن الخطاب قال تعلّموا الفرائض فانها من دینکم [1]

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ فرائض سیکھو کہ وہ تمہارے دین کا ایک حصہ ہے۔

وعنه تعلّموا الفرائض واللحن والسنة کما تتعلّمون القرآن [2]

انہی سے منقول ہے کہ جس طرح تم قرآن سیکھتے ہو اسی طرح فرائض، نحو اور سنت بھی سیکھو۔

۲۔ عن عبداللہ بن مسعود قال من تعلّم القرآن فلیتعلّم الفرائض [3]

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جو قرآن سیکھ لے تو اسے اب فرائض سیکھنا چاہیے۔

۳۔ عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ (الّا تفعلوه) الایة معناه ان لم تاخذوا المیراث بما امرکم الله (تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر) [4]

حضرت عبداللہ بن عباس قرآنی آیت "الّا تفعلوہ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ وراثت کے سلسلہ میں اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق عمل نہ کروگے تو روئے زمین پر بڑا فساد اور فتنہ برپا ہو جائے گا۔ *

---

[1] المغنی: ابن قدامہ طبع دار عالم الکتب الریاض ۵/۹ [2] حوالہ مذکور ۶/۹ [3] حوالہ مذکور [4] تفسیر ابن الجوزی المکتب الاسلامی بیروت، ۳/۳۸۶

* یہ سورۂ انفال کی آیت ۷۳ ہے۔ اس کا سیاق وسباق یہ ہے کہ مکہ سے مدینہ ہجرت فرض ہونے کے بعد مدینہ نے اسلامی ریاست کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے تمام شہریوں کے درمیان چاہے وہ انصار ہوں یا مہاجرین ولایت ورفاقت=

## اسبابِ وراثت

اپنی ضروریاتِ زندگی کو محدود کرکے اور خواہشوں کو روک کر کے انسان مال جمع کرتا ہے، زمین وجائداد بناتا ہے، یہ امید کرتے ہوئے کہ اس کے بعد پس ماندگان محتاج اور بے کس نہ رہیں گے، اس کے سہارے وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں گے، وہ اس بات کی شدید خواہش رکھتا ہے بلکہ اسی لیے وہ محنت ومشقت برداشت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مال اس کے قریبی رشتہ داروں ہی کے ہاتھ میں پہونچے اور اگر کوئی یہ جان لیتا ہے کہ اس کے بعد یہ مال دوسروں کو مل جانے گا، حکومت اس پر قبضہ کرلے گی تو وہ اسے زندگی ہی میں لٹانے کی کوشش کرتا ہے، فطرت کے اس تقاضے کا لحاظ کرتے ہوئے شریعتِ اسلامیہ نے وراثت کو ایسے افراد میں محدود کردیا ہے، جو اسے وجود بخشنے یا اس کے وجود کو باقی رکھنے کا ذریعہ ہیں، جن سے اس کی نسل چلتی ہے اور جن کے احسانات کے بوجھ تلے وہ دبا ہوا ہے اور جن کی احسان فراموشی کا وہ تصور نہیں کرسکتا ہے، ایسے لوگ جو زندگی بھر اس کے مددگار اور معاون بنے رہے، اس کے دکھ درد میں شریک اور آڑے وقت میں کام آتے رہے، ان سے اس کا رشتہ محبت والفت اور مودت و نصرت استوار ہے، انھوں نے اسے آزادی بخشی ہے، یا وہ زندگی کے سفر کا ساتھی ہے، ــــ چنانچہ اسبابِ وراثت کو تین تعلقات میں محدود کردیا گیا ہے: قرابت، زوجیت اور ولاء۔

### ۱۔ قرابت

قرابت یعنی خون اور نسب کا رشتہ۔ یہ چار طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے (۱) فروع

---

= کا رشتہ قائم ہوگیا جن مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت نہیں کی ان کے اور دارالاسلام مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان ولایت کا تعلق باقی نہ رہا۔ دونوں کے احکام بھی مختلف ہوگئے۔ اسی ذیل میں کہا گیا کہ اس پر عمل نہ ہو تو زمین میں فتنہ اور فساد برپا ہوگا۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کے ذیل میں وراثت کا مسئلہ بھی آتا ہے۔ (جلال الدین)

یعنی بیٹا، بیٹی وغیرہ (۲) اصول یعنی باپ، ماں، دادا، دادی وغیرہ (۳) عصبہ یعنی بھائی بھتیجا، چچا وغیرہ (۴) ذوی الارحام جیسے پھوپھی، ماموں، بھانجا، لڑکیوں کی اولاد وغیرہ ارشاد باری ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ — کتاب اللہ کی رو سے رشتہ دار

اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الاحزاب:۶) — ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس سے متعلق تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے قانونِ میراث میں قریب اور دور ہر طرح کے رشتہ داروں کا لحاظ رکھا ہے، اس میں بظاہر حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ارتکازِ دولت کا سدّباب ہو، مال چند ہاتھوں تک محدود نہ رہ جائے جس کی وجہ سے معاشرہ معاشی ناہمواری کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خاندان کے افراد کے درمیان الفت و محبت اور مدد و نصرت کا ماحول باقی رہے، اور ان میں باہم کینہ اور حسد کی فضا پیدا نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب یہ احساس ہوگا کہ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا وارث ہے تو بوقت ضرورت اس پر خرچ کرنے میں بوجھ نہیں محسوس ہوگا اور اس کی مدد اور تعاون میں ایک طرح کی آسودگی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بوقتِ حاجت شریعت نے نان نفقہ ان ہی لوگوں پر واجب قرار دیا ہے جو ایک دوسرے کے وارث قرار دئے گئے ہیں۔

واضح رہے کہ وارثوں کی فہرست میں مذکورہ تمام رشتہ دار شامل ہیں، لیکن وراثت کی تقسیم میں دوری اور نزدیکی کا خیال رکھا گیا ہے اور قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار کو محروم قرار دیا گیا ہے چنانچہ باپ کی موجودگی میں دادا اور اس کی موجودگی میں بھائی اور بھائی کے ہوتے ہوئے چچا محروم ہوتا ہے اور ذوی الارحام کا نمبر اس وقت آتا ہے جبکہ فروع اصول اور عصبہ میں سے کوئی موجود نہ ہو۔

## ۲۔ زوجیت

میاں، بیوی ایک دوسرے کے رفیق اور زندگی کے سفر کے ساتھی ہوتے ہیں۔

شوہر مال کماتا اور بیوی پر خرچ کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے عورت پر بالادستی حاصل ہے۔ وہ اس کی طرف سے دفاع کرتا ہے۔ عورت اس کے مال و جائداد کی محافظ بن کر رہی، اپنے آپ کو بہت سی چیزوں سے محروم کر کے مال جمع کرنے میں اس کے ساتھ تعاون کرتی رہی، باہمی الفت و محبت، مدد اور نصرت اور رفاقت کا تقاضا ہے کہ ان میں ہر ایک جو کچھ چھوڑ جائے دوسرے کا اس میں حق ہو اور اسے کسی حال میں محروم نہ کیا جائے، ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ | تمہیں اس ترکے کا آدھا ملے گا جو تمہاری |
| أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن | بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کی کوئی اولاد ہو |
| لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ | تو تمہارے لیے ان کے ترکہ سے ایک |
| لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ | چوتھائی ہے جو وہ وصیت کر جائیں اس کے |
| الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن | نفاذ اور ان کے قرض کی ادائیگی کے بعد، |
| بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا | اور تم جو چھوڑ جاؤ اس میں سے تمہاری |
| أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا | بیویوں کو ایک چوتھائی ملے گا اگر تمہاری |
| تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ | کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر اولاد ہو تو ان کے |
| فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ | لیے تمہارے ترکہ میں سے آٹھواں حصہ |
| الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ | ہے، اگر تم کوئی وصیت کر جاؤ تو اس کے |
| وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ (النساء:۱۲) | نفاذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ |

زوجیت سے مراد یہ ہے کہ مرد و عورت صحیح طریقے پر رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے ہوں، اگرچہ یکجائی کی نوبت نہ آئی ہو پھر بھی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، کیوں کہ مذکورہ آیت عام ہے اور صحبت ہونے یا نہ ہونے کو شامل ہے، دوسرے یہ کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی عورت کو وارث قرار دیا جس کے شوہر کی اس کے ساتھ یکجائی سے پہلے ہی وفات ہو گئی تھی۔[1]

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸/۲۵۱ الدکتور وہبۃ الزحیلی طبع دار الفکر دمشق ۱۹۸۹ء

## ۳۔ ولاء

کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دے اور اس آزاد کردہ غلام کا کوئی رشتہ دار اور قریبی وارث وغیرہ نہ ہو تو آزاد کرنے والا شخص اس کا وارث ہوتا ہے، وراثت کے اسی حق کو "ولاء" کہتے ہیں، یہ بھی نسبی رشتہ کی طرح ایک قابل احترام رشتہ ہے۔ کہ جس طرح سے باپ اپنے بیٹے کے وجود کا ذریعہ بنتا ہے، اسی طرح سے آقا بھی اسے آزادی کی نعمت سے سرفراز کر کے اسے معنوی وجود بخشتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الولاء لحمة كلحمة النسب[1] — ولاء ایک رشتہ ہے نسب کے رشتہ کی طرح

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

الولاء لمن اعتق[2] — ولاء اسی کو ملے گا جس نے آزاد کیا ہے

ولاء کی ایک دوسری قسم "ولاء الموالاۃ" ہے، جس کا مفہوم یہ ہے دو شخص آپس میں یہ معاہدہ کریں کہ ہم میں سے کسی سے قتل کا جرم سرزد ہو جائے تو دوسرا "دیت" کی ادائیگی میں شریک رہے گا اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ ایسی صورت میں قرابت داروں وغیرہ کی غیر موجودگی میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ (النساء: ۳۳) — اور جن لوگوں سے تم نے عہد کر رکھا ہے انھیں ان کا حصہ ادا کرو۔

واضح رہے کہ "ولاء الموالاۃ" کا سبب وراثت ہونا صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل اس کے قائل نہیں ہیں ان کے خیال کے مطابق یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا بعد میں حسب ذیل آیت کے ذریعہ وہ منسوخ ہو گیا۔

---

[1] رواہ ابن حبان والحاکم وقال الالبانی صحیح ارواء الغلیل ۶/۱۰۹ محمد ناصر الدین الالبانی طبع المکتب الاسلامی دمشق ۱۹۷۹ء

[2] رواہ البخاری، نیل الاوطار۔ ۶/۶۸

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الانفال: ۷۵)

اور جو لوگ باہم رشتہ دار ہیں کتاب اللہ میں ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حق دار ہیں۔

## وراثت کی شرطیں

وراثت کی شرائط بھی تین ہیں۔

۱۔ مورث کی موت، خواہ حقیقتاً ہو یا حکماً، موتِ حکمی کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی طور پر اس کی موت کے متعلق علم نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے اور ایک مدت کے بعد قاضی اس کی موت کا حکم لگا دے، یا کوئی شخص مرتد ہو کر اسلامی مملکت سے "دارالحرب" میں چلا جائے تو اسے بھی حکماً مردہ تصور کیا جائے گا۔

۲۔ مورث کے مرنے کے بعد وارث کی زندگی کا ثبوت۔ یہ بھی عام ہے کہ حقیقی ہو یا حکمی، جیسے حمل کہ اسے حکماً زندہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر زندگی کا ثبوت نہ ہو تو وہ وارث نہیں ہوگا۔ جیسے آگ لگ جانے یا ڈوب جانے، یا ہوائی جہاز کے حادثہ میں باپ، بیٹے کی وفات ہو جائے اور یہ نہ معلوم ہو کہ ان میں سے پہلے کس کی موت ہوئی ہے تو یہ ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں گے۔

۳۔ وراثت کی راہ میں جو چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں ان میں سے کوئی موجود نہ ہو۔

## مانعِ وراثت

وراثت کی راہ میں یہ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں: قتل، اختلافِ دین اختلافِ دار اور غلامی، ان میں سے کوئی بھی موجود ہو تو باہم وراثت جاری نہ ہوگی۔

### ۱۔ قتل

کوئی شخص اپنے مورث کو قتل کر دے تو اس کی میراث سے کچھ پانے کا حق دار نہ ہوگا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لیس للقاتل من المیراث شیئ[1] قاتل کے لیے میراث میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔

---

[1] رواہ الدارقطنی والبیہقی وقال الالبانی صحیح، ارواء الغلیل ۶/۱۱۷ نیز دیکھئے نیل الاوطار ۶/۷۴

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر قاتل کو وراثت کا حق دار قرار دیا جائے تو مورث کے قتل کا دروازہ کھل جائے گا۔ بہت سے بدبخت زمین وجائداد کو جلد حاصل کرنے کے لیے اپنے مورث کو قتل کرنے سے دریغ نہ کریں گے اور اس کی وجہ سے خوف اور لاقانونیت کا جو حال ہوگا وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ دوسرے یہ کہ قتل ایک شدید اور قبیح جرم ہے اور شریعت وعقل اسے درست نہیں سمجھتی ہے کہ کوئی جرم کسی انعام کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو۔

میراث میں رکاوٹ بننے والے قتل کی چار قسمیں ہیں۔ قتل عمد، قتل شبہ عمد، قتل خطا، قتل قائم مقام خطا۔ قتل عمد سے مراد یہ ہے کہ کسی کو جان بوجھ کر دھار دار یا قتل کے لیے استعمال ہوتے والے کسی بھی ہتھیار سے قتل کیا جائے۔ "قتل شبہ عمد" کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی چیز سے جان بوجھ کر مار ڈالا جائے جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتی، جیسے لاٹھی، ڈنڈا وغیرہ "قتل خطا" یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شکار پر بندوق چلائے اور وہ غلطی سے کسی انسان کو لگ جائے "قائم مقام خطا" یہ ہے کہ کوئی شخص چھت وغیرہ پر سے کسی آدمی پر گر پڑے اور وہ آدمی مر جائے۔ قتل کی ان تمام صورتوں میں قاتل میراث سے محروم ہوگا ــــ البتہ "قتل بالسبب" کی وجہ سے وراثت کا حق دار باقی رہے گا۔ جیسے راہ میں پتھر رکھ دے اور کوئی اس سے ٹکرا کر مر جائے۔ یا جھوٹی گواہی دے کر کسی کو عدالت کے ذریعہ قتل کرا دے تو ایسا کرنے والا شخص میراث سے محروم نہ ہوگا۔ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مورث حملہ آور ہو اور وارث دفاع کرتے ہوئے اس کو قتل کر دے، یا قاتل نابالغ بچہ یا پاگل ہو[1]

یہ تفصیل فقہ حنفی کے مطابق ہے۔ دیگر ائمہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ امام مالک کے نزدیک وہی قتل مانعِ وراثت ہے جو جان بوجھ کر اور ظلماً ہو "قتل خطا" مانعِ وراثت نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک قتل ہر حالت میں مانعِ وراثت ہے۔ یہاں تک کہ قاضی گواہی کی روشنی میں کسی کے قتل کا فیصلہ کر دے اور وہ مقتول کا وارث ہو تو اس کی میراث سے محروم ہوگا۔ اس لیے کہ حدیث عام ہے

---

[1] دیکھئے ردالمحتار ۱۰/۵۰۴، محمد امین الشامی، طبع مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۶ء

اور ہر طرح کے قتل کو شامل ہے۔ امام احمد بن حنبل کے نزدیک جس قتل کی وجہ سے ضمان اور تاوان لازم ہو (خواہ وہ تاوان قصاص کی شکل میں ہو یا دیت یا کفارہ کی صورت میں) وہ مانعِ وراثت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے اعتبار سے قتل کی مذکورہ چار صورتیں اور قتل بالسبب مانعِ وراثت ہے۔ یہی حکم بچے، پاگل اور سونے کی حالت میں قتل کا بھی ہے[1]

## اختلافِ دین

وراثت کی بنیاد باہمی تعاون اور ولایت پر ہے، چونکہ کافر و مسلم کے درمیان باہمی تعاون اور ولایت کا رشتہ باقی نہیں رہتا ہے اس لیے وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| لایرث المسلم الکافر | نہ تو کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث |
| ولا الکافر المسلم[2] | ہو سکتا ہے اور نہ کافر کسی مسلمان کا۔ |

جمہور صحابہ، تابعین اور فقہاء امت کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ البتہ حضرت معاذ بن جبل حضرت معاویہ، محمد بن الحنفیہ، سعید بن المسیب اور بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ کافر کسی مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کسی کافر کا وارث بن سکتا ہے، ان حضرات کے پیش نظر یہ دلائل ہیں۔

| | |
|---|---|
| عن معاذ بن جبل قال | حضرت معاذ بن جبل سے روایت |
| رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاسلام | ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے |
| یزید ولا ینقص[3] | ارشاد فرمایا کہ اسلام بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں۔ |

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بڑھنے کا ذریعہ ہے، نقص اور کمی کا سبب نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جائے گا کہ یہ اضافہ ہے اور کافر کو

---

[1] دیکھئے المغنی ۹/۱۵۲ [2] بخاری و مسلم، نیل الاوطار ۶/۷۳

[3] دیکھئے المغنی ۹/۱۵۴-۱۵۵ حاشیہ ردالمحتار ۱۰/۵۰۵-۵۰۷

مسلمان کا وارث نہیں بنایا جائے گا کہ اس کی وجہ سے کمی ہوگی اور اسلام کسی کمی کا ذریعہ نہیں بنتا ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ

الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ [1] — اسلام سربلند رہتا ہے اور کوئی دوسرا اس سے بلند نہیں ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ دونوں حدیثیں مبہم ہیں اور موضوع سے متعلق صریح نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی رہے گی، گھٹے گی نہیں اور دوسری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دلیل وحجت کے اعتبار سے ہمیشہ غالب رہے گا، کوئی اسے مغلوب نہیں کرسکتا ہے۔ اس کے برخلاف پہلی حدیث صحیح بھی ہے اور صریح بھی، لہٰذا اسے ترجیح حاصل ہوگی [2]

## مرتد

کوئی بدبخت اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلے تو بہ اتفاق وہ کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، لیکن کوئی مسلمان اس کا وارث ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں قدرے اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس نے مسلمان ہوتے ہوئے جو مال حاصل کیا ہے مرتد ہونے کے بعد اسے اس کے وارثوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے گا اور اس نے ارتداد کے بعد جو مال حاصل کیا ہے اسے "بیت المال" کے حوالے کردیا جائے گا یہ تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ مرتد کوئی مرد ہو، اگر مرد کے بجائے عورت مرتد ہو تو کسی تفصیل کے بغیر اس کے تمام مال کو وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

امام ابویوسف اور محمد کے نزدیک مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر تمام مال کو وارثوں کے حوالے کردیا جائے گا۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر الصدیقؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کی بھی یہی رائے ہے، تابعین میں حضرت سعید بن المسیب، عمر بن عبدالعزیز، امام شعبی اور ثوری بھی اسی کے قائل ہیں۔

اس کے برخلاف امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل کے نزدیک کسی تفصیل کے

---

[1] ایضاً [2] ایضاً ۳۳۲

بغیر تمام مال "بیت المال" میں داخل کر دیا جائے گا [۱] ان کے نزدیک اس میں اور کافر اصلی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا اسے مالِ غنیمت سمجھا جائے گا اور "بیت المال" میں جمع کر دیا جائے گا۔

حنفیہ کی دلیل خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کا طرزِ عمل ہے، نیز یہ کہ ارتداد ایک طرح سے موت ہے، جس کی وجہ سے مال مرتد کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں کافرِ اصلی اور مرتد میں بڑا فرق ہے کہ کافرِ اصلی یہودی و نصرانی ہو تو اس کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست ہے جب کہ مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں گرچہ وہ یہودی اور نصرانی ہو جائے اور نہ ہی کسی مرتدہ سے نکاح درست ہے۔ اس فرق کے ہوتے ہوئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، خصوصاً اس مال کے متعلق جسے اس نے حالتِ اسلام میں حاصل کیا ہے اور اس سے یک گونہ اس کے وارثوں کا حق متعلق ہو چکا ہے۔

زندیق (جیسے قادیانی) کا بھی وہی حکم ہے جو مرتد کا ہے [۲]

## کافروں کے مختلف فرقے

فقہاء کرام نے اس مسئلے پر بھی بڑی لمبی چوڑی بحث کی ہے کہ کافروں کے مختلف فرقے مثلاً یہودی، نصرانی، مجوسی اور بت پرست آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ حنفیہ، شافعیہ اور جمہور فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ کافروں کے تمام فرقے ایک مذہب کی طرح ہیں "الکفر ملة واحدة" لہٰذا اختلافِ مذہب کے باوجود وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ امام مالک نے کافرانہ فرقوں اور مذاہب کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے، یہودی، نصرانی اور دیگر فرقے۔ یہ تینوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ہیں، البتہ یہودی و نصرانی کے علاوہ تمام فرقے اور جماعتیں آپس میں وارث ہو سکتی ہیں۔

---

[۱] دیکھئے المغنی ۹/۱۵۹ و ۱۶۲ [۲] ایضاً ۹/۱۶۳

امام احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ جتنی بھی ملتیں اور فرقے ہیں ان میں سے ایک فرقہ دوسرے فرقے کا وارث نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| لایتوارث اھل ملتین | دو مختلف ملتوں کے حاملین میں |
| شتی [1] | وراثت جاری نہیں ہوگی۔ |

جو لوگ اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے ان کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں دو ملت سے مراد اسلام و کفر ہے۔ اسلام ایک ملت ہے اور کفر دوسری ملت، اور اس حدیث کا بھی وہی مفہوم ہے جو حدیث لایرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم سے مراد ہے۔ امام احمد بن حنبل کی رائے حدیث سے قریب تر ہے۔ اس اضافے کے ساتھ کہ وراثت کے سلسلہ میں خود ان کے مذہبی قانون پر عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

## ۳۔ اختلافِ دار

"اختلافِ دار" کا مفہوم یہ ہے کہ وارث و مورث کا تعلق دو الگ الگ ملکوں سے ہو، جن کے درمیان کوئی ربط و معاہدہ نہ ہو بلکہ جنگ ہو یا جنگ کا احول ہو، ایسی صورت میں نہ تو مسلمان ملک کا کافر کسی حربی کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ حربی کسی مسلمان ملک کے کافر کا۔ یہ حکم کافروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ رہے مسلمان تو وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، جہاں بھی رہیں [2]۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اسی کے قائل ہیں۔ امام احمد سے بھی ایک قول اسی کے مطابق منقول ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک کی رائے اور امام احمد بن حنبل کا دوسرا قول یہ ہے کہ کافروں کے لیے بھی اختلافِ دار مانع نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت نے اختلافِ دین کی طرح اختلافِ دار کو وراثت کے لیے مانع قرار نہیں دیا ہے۔ اس سے متعلق نہ تو کوئی قرآنی آیت ہے اور نہ حدیث اور نہ ہی اس پر اجماعِ امت ہے بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ دو مختلف ملت کے لوگ آپس میں وارث نہیں ہوسکتے ہیں، اس کے عموم کا تقاضا ہے

---

[1] رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ عن عبداللہ بن عمرو وللترمذی مثلہ عن جابر نیل الاوطار ۶/۷۳ قال الالبانی سندہ حسن، ارواء الغلیل ۶/۱۲۱

[2] رد المحتار ۱۰/۵۰۹

کہ اگر ملت ایک ہو تو وراثت جاری ہوگی گرچہ ملک مختلف ہو کیونکہ وراثت کی بنیاد یعنی اتحادِ ملت موجود رہے[1]

## ۴۔ غلامی

کوئی شخص غلام رہتے ہوئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا اور اس کے قبضے میں موجود تمام چیزوں کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے، اور جب وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے تو اس کا کوئی کیسے وارث ہو سکتا ہے اور اس کے رشتہ داروں کی موت پر اسے وارث قرار دیا جائے تو جو کچھ اسے ملے گا وہ خود اس کا مالک نہیں ہوگا بلکہ آقا کے قبضے میں چلا جائے گا، اس طرح سے ایک غیر رشتہ دار کو وارث بنانا ہوگا۔ لہٰذا نہ تو وہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ اس کے رشتہ دار اس کے وارث ہوں گے۔ چونکہ اب یہ مسئلہ موجود نہیں ہے اس لیے اس سے متعلق تفصیلات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

## ولدِ زنا و لعان اور لقیط

بدکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ زانی کا وارث نہ ہوگا گرچہ زانی اقرار کرے کہ وہ اسی کا نطفہ ہے، کیونکہ شریعت زانی سے اس کے نسب کو تسلیم نہیں کرتی۔ البتہ یہ بچہ اپنی ماں اور اس کے رشتہ داروں کے ترکے میں حق دار ہوگا، یہی حکم اس بچے کا بھی ہے، جس کے باپ نے اسے اپنا بچہ ماننے سے انکار کر دیا ہو اور لعان کے ذریعہ اس کے ماں سے علیحدگی اختیار کر لی ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ

| | |
|---|---|
| عن عمرو بن شعیب | حضرت عبداللہ بن عمرو سے |
| عن ابیہ عن جدہ عن | منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے |
| النبی صلی اللہ علیہ وسلم | لعان کردہ لڑکے کے ترکے کا حق دار |
| انہ جعل میراث ابن الملاعنۃ | اس کی ماں کو قرار دیا اور اس کی |
| لأمہ ولورثتہا من بعدھا[2] | غیر موجودگی میں اس کے رشتہ داروں کو |

---

[1] المغنی ۹/۱۵۸

[2] رواہ ابوداؤد، نیل الاوطار ۶/۶۶

ایک دوسری روایت میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وکان ابنها نیسب | لعان کردہ لڑکا اپنی ماں کی طرف منسوب |
| الی أمّه فجرت السنة | تھا اور اسی وقت سے یہ طریقہ جاری ہوگیا |
| انه یرثها وترث | کہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوتا اور ماں اس کی |
| منه [1] | وارث ہوتی۔ |

یہ ایک اجماعی اور اتفاقی مسئلہ ہے [2]

پرورش کی ذمہ داری نہ اٹھا سکنے کی وجہ سے یا بدنامی کے اندیشہ سے کچھ لوگ اپنے بچوں کو کہیں پھینک آتے ہیں، ایسے بچے کو شریعت کی اصطلاح میں لقیط کہا جاتا ہے، جو شخص اسے اٹھالے اسی کے پاس بچے کو رہنے دیا جائے گا البتہ اس کے خرچ کی ذمہ دار اسلامی حکومت ہوگی، وہی اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں جواب دہ ہے، اسی لیے اس کی میراث کا حق دار بھی "بیت المال ہے، اس مسئلہ پر بھی تمام فقہاء کا اتفاق ہے [3]

بعض لوگوں نے مانع وراثت میں ان چیزوں کو بھی شمار کیا ہے اور اسی مناسبت سے اسے یہاں نقل کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق مانع وراثت سے نہیں ہے بلکہ اسباب وراثت سے ہے کہ وراثت کا سبب یعنی ثبوت نسب اور قرابت موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو وارث قرار نہیں دیا گیا ہے [4]

---

[1] متفق علیہ نیل الاوطار ۶/ ۶۶

[2] المغنی ۹/ ۱۱۵

[3] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۸/ ۲۳۲

[4] ردالمحتار ۱۰/ ۵۱۱

## ترجمہ وتلخیص

# مکہ مکرمہ پر ابرہہ کے حملے کے مقاصد ونتائج
## ایک تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر ریاض ہاشم نعیمی

ترجمہ: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

بہت سے محقّق مورخین نے ابرہہ حبشی کی مکہ مکرمہ پر فوجی چڑھائی کے اسباب سے بحث کرکے اس موضوع پر کافی مواد طبع کر دیا ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ اُس وقت کے قریش کے سردار عبدالمطلب کے موقف کی حقیقت اور اس کی حکمت سے بحث کرتے ہیں، نہ اس موضوع سے متعلق ابن اسحاق کی روایت کی صحت وعدم صحت کی طرف توجہ کرتے ہیں، نہ اس روایت کی غرض وغایت کا پتہ لگاتے ہیں۔ موجودہ بحث انہی خامیوں کی تلافی کے لیے کی جارہی ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس ظالمانہ فوج کشی کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی اسباب کا جائزہ لیں اور ابن اسحاق کی روایت پر بحث کرکے اس سے صحیح نتائج حاصل کریں۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے:

> جب ابرہہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس کی فوج نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑ لیے، ان کی واپسی کے لیے عبدالمطلب نے ابرہہ سے ملاقات کی، تو ابرہہ نے کہا: جب میں نے تم کو دیکھا تو مجھے پسند آئے، لیکن جب تم نے بات کی تو میری نظر میں تمہاری قدر گھٹ گئی! کیا تم مجھ سے ان دو سو اونٹوں کے بارے میں بات کرتے ہو جو میں نے پکڑ رکھے ہیں، اور اس گھر کو نظر انداز کر رہے ہو جو تمہارے اور تمہارے آباواجداد کا دینی مرکز ہے اور جس کو

میں ڈھانے آیا ہوں، تم اس کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کرتے؟
عبدالمطلب نے جواب دیا: میں اونٹوں کا مالک ہوں، اسی طرح اس گھر کا بھی ایک مالک ہے جو اس کی حفاظت کرے گا۔
ابرہہ نے کہا: وہ اس کو مجھ سے نہیں بچا سکے گا۔
عبدالمطلب نے جواب دیا: تم جانو اور تمہارا کام! یا تم اس سے نپٹ لو!

اس روایت کو علی حالہ تسلیم کرنا عربوں کی اپنے ملک وملت اور عزت وآبرو کی، زندگی کے آخری لمحات تک حفاظت وحمایت کی بلند روایات واخلاق سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔

## فوجی مہم جوئی کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی مقاصد

یمن میں ابرہہ کا اقتدار مستحکم ہوا تو معاصر حکام وملوک کے نزدیک بھی اس کا مقام بلند ہوگیا، سب نے اس سے سیاسی وتجارتی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیے[۲] سدِّ مأرب میں دریافت ہونے والی لوحوں سے متعلق روایت کے مطابق ۵۴۳ء میں اس کے دربار میں پانچ سلطنتوں کی سفارتیں پہنچی تھیں۔ اکسوم، بیزنطہ، ایران مناذرہ، غساسنۃ[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود مختار بادشاہ بن گیا تھا، حاکم حبشہ اکسوم (جس نے اس کو یمن پر حملہ کے لیے بھیجا تھا) نے بھی اس سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی، بلکہ ایک بڑے مقصد کے لیے ایک طرح کی دوستی قائم کرلی، اس لیے کہ ان دونوں کے ساتھ بیزنطہ کے رومی حکام کا مقصد بھی پورے عرب علاقہ کو عیسائیت کے ماتحت لانا تھا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابرہہ یمن میں اپنی حکومت کو عیسائی رنگ میں رنگنے کے لیے پوری طرح کوشاں تھا، سدِّ مأرب میں دریافت شدہ لوحوں پر درج اس کی تحریریں اس عبارت سے شروع ہوتی تھیں:

بحول وقوة الرحمٰن و مسیحه وروح القدس[۴] — رحمٰن، اس کے مسیح اور روح القدس کی رحمت اور قوت وقدرت سے (شروع کرتا ہوں)

اسی طرح اس نے مأرب میں قلیس گرجا تعمیر کرکے اس کی خدمت کے لیے سبا کے

عیسائیوں کی ایک جماعت کو متعین کیا، اور خود اس گرجا کا افتتاح کیا۔[۵] اس لیے ہم ابرہہ کے مکہ مکرمہ پر حملہ کے سیاسی، اقتصادی اور دینی مقاصد میں فرق نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ ایک دوسرے میں ملے جلے ہوئے ہیں، بہرحال یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یمن پر خود مختارانہ تسلّط کے بعد ابرہہ کی سیاسی طالع آزمائی نے اقتصادی عامل سے مربوط ہو کر مکہ مکرمہ پر فوج کشی کو مذہبی رنگ دے دیا۔

ابرہہ کو عطریات کی تجارت کے راستہ پر قبضہ کی بڑی فکر تھی، یہ راستہ جنوبی جزیرۂ عرب سے ملک شام تک پھیلا ہوا تھا اور درمیان میں اس علاقہ کے قدیم تجارتی مرکز مکہ مکرمہ سے گزرتا تھا، مکہ مکرمہ اپنی مرکزیت کے باوجود کبھی کسی بیرونی طاقت کے تسلّط کا شکار نہیں ہوا تھا، وہ ہمیشہ آزاد رہا اور اپنے سیاسی، اقتصادی اور دینی مفادات کے لیے کام کرتا رہا، بہرحال اس تجارتی شاہراہ اور اس کے اہم ترین تجارتی مرکز مکہ مکرمہ کے خلاف ابرہہ کی امنگیں اور آرزوئیں بیزنطی سلطنت اور اکسوم کی حکومت کے عام مقاصد کے خلاف بھی نہ تھیں، اس لیے ابرہہ نے مکہ مکرمہ کے سیاسی، اقتصادی اور دینی نفوذ کو ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا تاکہ اس کے بعد حجاز کے باقی علاقوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعہ اپنا تسلّط قائم کرے۔[۶] طبری لکھتا ہے:

> نجاشی کے ابرہہ سے راضی ہونے اور حکومتِ یمن پر اسے برقرار رکھنے کے بعد ابرہہ نے صنعا میں بے نظیر اور شاندار گرجا تعمیر کیا، اس کو سونے اور اعلیٰ قسم کے رنگوں سے سجایا، قیصر کو لکھ کر مطلع کیا کہ وہ صنعا میں ایک ایسا گرجا بنانا چاہتا ہے جس کا نام اور عظمت ہمیشہ باقی رہے، اور اس سے اس کے لیے مدد طلب کی، قیصر نے کاریگر اور اعلیٰ قیمتی رنگ برنگ کے پتھر اور سنگِ مرمر وغیرہ بھیج کر اس کی مدد کی۔
>
> تعمیر کی تکمیل کے بعد ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں عرب حاجیوں کو صنعا کے گرجا کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں۔ عربوں کو پتہ چلا تو ان کو یہ بات بڑی گستاخی معلوم ہوئی اور بہت شاق گذری، چنانچہ بنو کنانہ

کے ایک خاندان بنو مالک کا ایک مرد چل کر یمن پہنچا اور ہیکل میں جا کر
حَدَث کر کے اس کو گندہ کر دیا، اس جسارت پر ابرہہ بہت غصہ ہوا
اور اس نے مکہ پر حملہ اور بیت اللہ کو ڈھانے کا تہیہ کر لیا۔[۵]

طبری کی مذکورہ عبارت سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن سے اس مہم جوئی کی حقیقت اور اس کے دُور رس مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ابرہہ اور بیزنطہ کے رومی حاکم کے درمیان پہلے بڑے پیمانے پر صنعاء میں قلیس گرجا بنانے کے منصوبہ پر اتفاق و تعاون ہوا پھر اس کی تنفیذ ہوئی۔

۲۔ اس گرجا کی تعمیر کا واضح مقصد، جیسا کہ ابرہہ نے شاہِ حبشہ کو مطلع کیا، عرب حجاج کو مکہ میں بیت اللہ سے منحرف کرنا تھا، جس کے لیے محمد بن خزاعی کو مصر پر امیر بنا کر اس کو حکم دیا گیا کہ وہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے ان کو قلیس گرجا کے حج کی دعوت دے۔[۶]

۳۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکہ پر حملہ صرف کسی عرب قبیلہ کے ایک فرد کے گرجا میں حَدَث کر دینے کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ عام عربوں پر تسلّط جمانے کے بڑے سیاسی منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا، یعنی اس حملہ کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعہ عربوں کو شمال میں بیزنطی تسلّط اور جنوب میں حبشی تسلّط کے ماتحت لانا تھا۔

۴۔ اس حملہ کا مقصد مکہ سے گذرنے والے تجارتی راستہ پر قبضہ اور اس کو شمال میں بیزنطی رومیوں کی مدد سے یمن کے حکام کے تابع فوجی چھاؤنی بنانا تھا تاکہ اس طرح یہ راستہ مکمل طور پر ان کے ماتحت ہو جائے۔

۵۔ ابرہہ کے مقرر کردہ نائب محمد بن خزاعی کا قتل اہلِ تہامہ کے ہاتھوں ہوا تو ابرہہ غصّہ سے مشتعل ہو گیا اور تمام جنوبی قبائل کو اپنے ماتحت کرنے کے لیے فوجی مداخلت کا عزم کر لیا چنانچہ اپنے منصوبہ کو نافذ کرنے کے لیے اس نے فوراً خود ہی اقدام کیا۔ طبری لکھتا ہے:

اہلِ تہامہ کو جب (مذکورہ مقصد کے لیے) محمد بن خزاعی کے تقرّر

کا علم ہوا تو انھوں نے ایک شخص کو بھیج کر اسے قتل کروا دیا[۹]۔
جب ابرہہ کو خزاعی کے قتل کی خبر ملی تو غصہ ہوا، اور قسم کھائی کہ
بنو کنانہ پر حملہ کر کے خانۂ کعبہ کو ضرور ڈھا دے گا[۱۰]

مکہ پر حملہ سے متعلق راست اور واضح یمنی تحریری دستاویزات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ اہلِ بحث و تحقیق نے صرف اخباریوں سے منقول زبانی روایتوں پر اعتماد کیا ہے[۱۱] جن میں تاریخی دقت رسی مفقود ہے، اس کے باوجود اس حملہ کے سیاسی، اقتصادی اور دینی اسباب و عوامل میں ایک دوسرے سے خلط ملط اور مداخلت واضح ہے، اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ حملہ سیاسی و اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے تھا جس نے دینی روپ اختیار کر لیا تھا۔

تاریخی روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حجاز پر قبضہ کے لیے ابرہہ کا یہ واحد حملہ نہ تھا، بلکہ اس سے پہلے بھی کئی کوششیں ہو چکی تھیں، چنانچہ بعض اہلِ تحقیق کے نزدیک ۵۴۷ء کے لگ بھگ ابرہہ نے بنی عامر کے علاقہ پر ہلہ بول دیا تھا، یہ علاقہ مکہ کے نجدی مضافات میں طائف کے جنوب مشرق میں تقریباً اسّی میل کے فاصلے پر ہے[۱۲] بہر حال یہ حملہ کامیاب نہ ہو سکا اور ابرہہ مکہ تک پہنچنے میں ناکام رہا، اس لیے کہ عربوں کی مزاحمت نے اس کو راستہ ہی میں چور چور کر دیا تھا، اور وہ زیادہ تیاری کے ساتھ دوبارہ واپسی کی امید پر لوٹ گیا۔

تاریخی مصادر میں ۵۶۷ء ـ ۵۷۱ء کے دوران ابرہہ کے ایک اور حملہ کا ذکر ملتا ہے جس کے لیے اس نے خوب تیاری کی تھی، مقصد وہی یمن سے مکہ تک کے راستے پر آباد تمام عرب قبائل کو اپنے زیرِ اقتدار لانا تھا، اس حملہ میں ہاتھیوں کے استعمال کی وجہ سے ابرہہ مکہ تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا، اسی لیے مؤرخین نے اس کا نام حملۃ اصحاب الفیل رکھا، اور قرآن شریف نے بھی اس کا ذکر اصحاب الفیل ہی کے نام سے کیا ہے، اس حملہ سے متعلق خاصی تفصیلی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد عرب قبائل نے قدم قدم پر اس کو مکہ تک پہنچنے سے روکنے کے لیے آویزش کی، لیکن وہ سب کو پسپا کرتا ہوا اس مرتبہ آخر کار مکہ پہنچ ہی گیا، اور خانۂ خدا کے سامنے مع اپنے لشکر

اور ہاتھیوں کے خیمہ زن ہوا تاکہ اصل منصوبہ کے مطابق اسے ڈھا دے اور عرب حجّاج کو مکہ سے ہٹا کر قلیس گرجا کی طرف پھیر دے، بہرحال مکہ پہنچنے کے بعد اس نے اس کے سردار و رہنما عبدالمطلب کو پیغامبر کے ذریعہ اپنے مطالبہ کی اطلاع بقول ابن اسحاق، ان الفاظ میں دی :

"بادشاہ تم کو مطلع کرتے ہیں کہ میں تم لوگوں سے جنگ کے لیے نہیں آیا ہوں، میں تو صرف اس گھر کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں، اس لیے اگر تم اس کو بچانے کے لیے جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں"[۱۳]

یہ سن کر سردارِ قوم عبدالمطلب نے صرف یہ کیا کہ مکہ کے باشندوں کو مکہ چھوڑ کر اس سے نکل جانے کا حکم دے دیا، اس لیے کہ ان کو اس سے لڑنے کا یارا نہ تھا[۱۴]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قریش کے سردار اور بنی ہاشم کے قائد عبدالمطلب کا اس حد تک منفی مصالحانہ موقف کیا عقل و منطق کے لیے قابلِ قبول ہے ؟ کیا حملہ آور کے ظالمانہ، ناجائز اور بے جا مطالبہ پر اعتراض یا معمولی درجہ کے اظہارِ ناپسندیدگی تک کا ان میں دم خم نہ تھا ؟ حالانکہ اہلِ مکہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنے شہر کی سیادت و اقتدار کے خلاف نہ کوئی حرف سن سکتے تھے، نہ بیت اللہ کی عزت و حرمت پر آنچ آنے دے سکتے تھے، لیکن ابن اسحٰق کی قدیم ترین روایت بتاتی ہے کہ :

ابرہہ نے جب سنا کہ عبدالمطلب اپنی قوم کے سردار ہیں تو ان کو ملاقات کی اجازت دے دی، لیکن ان کو اپنے پہلو میں بٹھانا پسند نہ کیا، اس لیے خود اپنے تخت سے اتر کر زمین پر بچھے ہوئے فرش پر عبدالمطلب کے ساتھ بیٹھ گیا، ترجمان کے ذریعہ جب ابرہہ نے ان سے ان کی ضرورت کی بابت معلوم کیا تو عبدالمطلب نے کہا: میری ضرورت یہ ہے کہ میرے دو سو اونٹ واپس کر دیں جن کو آپ کے فوجیوں نے پکڑ لیا ہے[۱۵]

ابرہہ نے جواب دیا: جب میں نے تم کو دیکھا تو تم مجھ کو پسند آئے، لیکن جب تم بولے تو میری دلچسپی تم سے ختم ہوگئی، کیا تم مجھ سے ان دوسو اونٹوں کی بابت بات کرتے ہو جو میں نے پکڑ لیے ہیں؟ اور اس گھر کو چھوڑ رہے ہو جو تمہارے اور تمہارے باپ دادا کا دین ہے (یعنی مرکزِ دین ہے)؟ اور جس کو میں ڈھانے آیا ہوں، تم اس کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کرتے؟

عبدالمطلب نے کہا: اونٹوں کا مالک میں ہوں، اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہی اس کی حفاظت کرے گا۔

ابرہہ کے کہا: وہ اس کو مجھ سے نہیں بچا سکے گا۔

عبدالمطلب نے جواب دیا: تم اس سے نپٹ لو۔[۱۶]

حملہ آور ابرہہ اور بنو ہاشم کے سردار، قریش کے رہنما عبدالمطلب کے درمیان مذکورہ گفتگو پر تمام تاریخی مصادر کا اتفاق ہے، ابن اسحٰق کی روایت کا باقی حصہ یہ ہے:

عبدالمطلب قریش کے پاس واپس پہنچے تو صورتِ حال سے مطلع کر کے ان کو ابرہہ کے لشکر کے سامنے ذلت و رسوائی کے خوف سے مکہ سے نکل کر پہاڑیوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں میں پناہ لینے کا حکم دیا، پھر قریش کے کچھ افراد کے ساتھ کعبہ پہنچے، اور اس کے دروازہ کا حلقہ (زنجیر) پکڑ کر ابرہہ اور اس کے لشکر کے خلاف بددعا کی، اللہ سے مدد مانگی اور یہ کہا:

لاهمّ ان العبد یمنع رحله فامنع حلالك

اے اللہ آدمی اپنے اہل کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر

لا یغلبنّ صلیبهم ومحالهم غدوًا محالك

کل ان کی صلیب اور قوت تیری قوت پر ہرگز غالب نہ آنے پائے

ان کنت تارکهم وقبلتنا فأمرٌ ما بدا لك[۱۷]

اگر تو نے ہمارے قبلہ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو پھر تیرا جو جی چاہے کر

پھر عبدالمطلب نے کعبہ کے دروازہ کا حلقہ چھوڑ کر قریش کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر پناہ لی اور وہاں انتظار کرنے لگے کہ ابرہہ مکہ میں داخل ہو کر کیا کرتا ہے؟

ان تمام عبارتوں سے سردارِ عرب و قریش و بنی ہاشم عبدالمطلب کے مطلبی بن اوران کی کس مپرسی کا ناقابلِ یقین حال سامنے آتا ہے، اس لیے اس روایت کی تحقیق ضروری ہے۔

## ابن اسحٰق کی روایت کی تحقیق

یہ روایت اگرچہ سیرۃ ابن ہشام، ازرقی کی اخبارِ مکہ اور طبری کی تاریخ الرسل والملوک میں بھی موجود ہے، لیکن سب کا اعتماد قدیم ترین تاریخی مصدر سیرۃ ابن اسحٰق ہی پر ہے۔ بظاہر اس کی سند میں بھی کوئی سقم معلوم نہیں ہوتا، اس کے باوجود اس کی تحقیق کے لیے قریش سے پہلے مکہ کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ازرقی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تبابعہ کی جانب سے خزاعہ کے عہد میں بھی مکہ پر حملہ کی ایک کوشش ہوئی تھی، وہ روایت یہ ہے:

> خزاعہ بیت اللہ کی ولایت اور مکہ کی حکومت پر تین سو سال تک برقرار رہے، ان کے زمانہ میں بعض تبابعہ بیت اللہ آئے اور اس کو برباد کر کے ڈھانا چاہا، ان کے مقابلہ کے لیے خزاعہ اٹھے اور انھوں نے بیت اللہ کی حفاظت کے لیے سخت ترین جنگ کی، یہاں تک کہ تبابعہ لوٹ گئے [۱۸] اس کے علاوہ بیت اللہ کو مٹانے کی دیگر کوششیں ہوئیں جو ناکام رہیں [۱۹]

یمن کے یہ تبابعہ حکام بت پرست تھے، انھوں نے بھی اپنے سیاسی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے مکہ پر قبضہ کرنا چاہا تھا اور بیت اللہ کی بربادی کو اس کا ذریعہ بنایا تھا، لیکن خزاعہ نے بیت اللہ کی حفاظت کے لیے سخت ترین جنگ کی یہاں تک کہ بقول ازرقی: (انھوں نے تبع سوم کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ) اس نے بیت اللہ کے لیے جانور ذبح کیے، اس کو پوشاک پہنائی، اس کے لیے دروازہ بنایا، پھر کئی دن اس کے پاس قیام کیا اور ہر روز سو اونٹ ذبح کرتا رہا [۲۰]

یہ خزاعہ بھی عرب اور بیت اللہ کے محافظ تھے، اسی لیے انھوں نے

بیت اللہ کی حفاظت اور بیرونی حملہ کے خلاف موت تک مدافعت کو اپنا فرض سمجھا، دوسری طرف تبابعہ بھی بڑے طاقتور حنگ جو تھے، وہ بھی ابرہہ کی طرح بیت اللہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور راستہ میں جو بھی مزاحم ہوا اس کو روندا، تیسری طرف حجاز کے بت پرست بھی عرب تھے جو بیت اللہ کو نقصان پہنچانے والی کسی طاقت کے ساتھ نرمی برتنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہ اس میں ان کے بت رکھے ہوئے تھے، اور قریش کے ساتھ ان کے موسم سرما و گرما کے تجارتی کاروانوں کا مرکز مکہ تھا، اور ان دونوں کی حفاظت و بقا سے ان کا اپنا مفاد وابستہ تھا، اس لیے وہ ہر اس طاقت سے جنگ کرتے ہیں جو قریش، ان کے دینی مقدسات اور جزیرۂ عرب کے شمال و جنوب میں ان کے مقام و مرتبہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔[۱۲۱]

اس پس منظر میں حملہ آور ابرہہ کے خلاف عرب اور قریش کے سردار عبدالمطلب کے موقف سے متعلق ابن اسحٰق کی روایت کا دوسری روایت سے باریکی کے ساتھ موازنہ و تجزیہ کرکے اس کو قبول یا رد کرنا چاہیے، تاکہ تاریخی تنقید کا حق ادا ہو، ایسا کرنے سے عبدالمطلب کا دشمن کے خلاف موقف اتنی بے بسی، پست ہمتی اور خود سپردگی کا نہیں معلوم ہوگا جیسا کہ ابن اسحٰق کی روایت سے جھلکتا ہے، اونٹوں کی واپسی سے متعلق روایت کے ٹکڑے کو تسلیم کرنے میں تو حرج نہیں، مگر ابرہہ، اس کی حبشی فوج اور ہاتھیوں کی قوت کے سامنے مکمل خود سپردگی کا اظہار یقیناً ناقابل قبول ہے، قوم کے سردار اور مکہ کے لیڈر ہونے کے ناتے عبدالمطلب کا فرض تھا کہ وہ مکہ کی حفاظت کے لیے کچھ اقدامات کرتے، ہمارے پاس اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے عرب قبائل کے بعض سرداروں کو بلایا اور ابرہہ سے گفتگو کے لیے ایک وفد تشکیل دیا، اس کے بارے میں ابن اسحٰق نے لکھا ہے:

> عبدالمطلب کے ساتھ ابرہہ کے پاس بنی بکر کے سردار حناطہ بن لعیر بن نفاثہ بن عدی بن دُئل بن بکر بن مناۃ بن کنانہ اور ہذیل کے سردار خویلد بن واثلہ ہذلی گئے اور ان سب نے ابرہہ

کے سامنے تہامہ کے تہائی مال کی پیشکش اس شرط کے ساتھ کی کہ ابرہہ ان کے علاقہ سے واپس چلا جائے اور بیت اللہ نہ ڈھائے لیکن اس نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[۲۲]

یہ ابرہہ کو مکہ سے واپس پھیرنے کے سلسلے میں عبدالمطلب کی پہلی کوشش تھی۔ اس سفارت کی ناکامی کے بعد عبدالمطلب نے مکہ اور خانۂ کعبہ کو حملہ آور لشکر سے بچانے کے لیے یقیناً دوسرے احتیاطی اقدامات کیے ہوں گے، لیکن ہمارے تاریخی مصادر ان کا ذکر نہیں کرتے، وہ صرف ابن اسحٰق کی یہ روایت ذکر کرتے ہیں کہ سفارت کی ناکامی کے بعد عبدالمطلب بیت اللہ کو تقدیر آسمانی پر چھوڑ کر پہاڑ کی طرف نکل گئے، لیکن خود ابن اسحٰق کے بیانات میں واضح بے ربطی موجود ہے، وہ ایک طرف لکھتے ہیں: "پھر عبدالمطلب نے کعبہ کے دروازہ کا حلقہ چھوڑا، اور ان کے ساتھ جو قریشی تھے ان کو لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ لی"[۲۳] اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں: "مکہ میں عبدالمطلب اور ابواحیحہ بن مغیرہ مخزومی کے علاوہ کوئی نہیں بچا، وہ دونوں حجاج کو کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تھے"[۲۴] نیز ابن اسحٰق کی اس روایت میں دقت رسی اور باریک بینی بھی مفقود ہے، چنانچہ انھوں نے ایک طرف لکھا ہے:

"عبدالمطلب اور اہل مکہ سب کے سب پہاڑوں کی طرف نکل کر انتظار کرنے لگے کہ اب ابرہہ ان کے شہر اور اس کے مقدسات کے ساتھ کیا کرتا ہے اور سردارانِ قوم اس حملہ کے مقابلہ میں ہاتھ پر ہاتھ باندھے بیٹھے رہے"۔

دوسری طرف کئی تاریخی مصادر مع ابن اسحٰق ان کوششوں کا ذکر کرتے ہیں جو عرب قبائل کے رہنماؤں نے بیت اللہ کو بربادی سے بچانے کے لیے کی تھیں، چنانچہ خود ابن اسحٰق نے بھی لکھا ہے:

"جب عربوں نے یہ سنا کہ ابرہہ بیت اللہ کو ڈھا دینا چاہتا ہے تو اس کو بہت بڑی جسارت مانا، اس کی پوری فکر کی، اور ابرہہ کے خلاف اپنے اوپر جہاد فرض سمجھا"۔[۲۵]

پھر عرب اشراف ابرہہ سے جنگ کے لیے جمع ہوئے تو ابن اسحٰق نے لکھا:

"اہلِ یمن کے اشراف اور ملوک میں سے ایک شخص ابرہہ کے خلاف اٹھا جس کا نام "ذونفر" تھا، اس نے اپنی قوم اور تمام عربوں کو ابرہہ کے خلاف جنگ کی دعوت دی جس نے بیت اللہ کی بربادی کے عزم کا اظہار کیا تھا، تو اس کی دعوتِ جہاد پر لوگوں نے لبیک کہا۔[۲۶] وہ لوگ جب ابرہہ کے مقابلہ میں سامنے آئے تو اس نے ان کو شکست دی، پھر جب وہ خثعم کے علاقہ میں پہنچا تو نفیل بن حبیب خثعمی اور اس کے تابع عرب قبائل نے ابرہہ سے جنگ کی یہاں تک کہ ابرہہ نے ان کو شکست دی۔[۲۷]"

ان روایات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب قبائل کے سردار اپنے رہنما قریش اور اپنے مقدس بیت اللہ کی حفاظت کے لیے راستہ بھر ابرہہ کا ناک میں دم کیے رہے، لیکن زیرِ بحث روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ مکہ پہنچا ہے تو ناقابلِ یقین حد تک ذلت و خواری سے خود قریش اور ان کے سردار عبدالمطلب ابرہہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں، وہ نہ اپنے دینی مقام و مرتبہ کے مقدس مرکز بیت اللہ کے لیے کچھ کرتے ہیں، نہ شمالی و جنوبی عربوں کے تجارتی مرکزی مقام مکہ کی حفاظت کے لیے تدابیر اختیار کرتے ہیں، بس چپکے سے جان بچا کر پہاڑوں پر سے تماشا دیکھتے ہیں۔

ان تمام بیانات کے تناقضات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابن اسحٰق کی زیرِ بحث روایت، جس پر بیشتر مؤرخین و مفسرین[۲۸] نے اعتماد کیا ہے، تحریف کا شکار ہوئی ہے۔ اس کا مقصد قریش اور عبدالمطلب کے واسطہ سے نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کرنا اور عوامی ذہن کو گمراہ کرنا تھا، یہ بات بعید بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سیرتِ نبوی کی تدوین عہدِ اموی کے اواخر اور عصر عباسی کے اوائل میں اس وقت ہوئی جبکہ مذہبی و سیاسی مفادات کے حصول کے لیے مختلف فرقوں اور گروہوں کا وجود عام بات ہو گئی تھی، شعوبیت اور مجوسیت نے بظاہر عربوں کے خلاف اور بباطن اسلام کے خلاف زبان درازی شروع کر دی

تھی، اور عربی و اسلامی رموز کو بدنام کرنے کی برملا کوششیں جاری تھیں، اس ماحول میں سیرتِ نبوی کے تاریخی مواد میں کھلواڑ کا موقع غرض مندوں کو حاصل تھا، ورنہ عقلی و منطقی طور پر یہ بات کیسے درست سمجھی جائے کہ قریش سے پہلے کے سردارِ مکہ خزاعہ تو حکّامِ یمن کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادیں، لیکن قریش کے سردار عبدالمطلب مکہ اور بیت اللہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر سارے باشندوں کو شہر خالی کرنے کا حکم دے کر سب کے سب پہاڑوں کی طرف نکل جائیں، حالانکہ یہ وہی اولوالعزم، جرأتمند اور بہادر عبدالمطلب تھے جن کو ہم زمزم کی کھدائی کے موقع پر دیکھتے ہیں جبکہ ان کی صرف ایک اولاد نرینہ[۲۹] تھی، اور یہ وہی عبدالمطلب تھے جو فجّار کی جنگوں میں قریش کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑتے اور اپنی طاقت و قوت کا سکہ جماتے تھے[۳۰]۔ نیز یہ وہی عبدالمطلب تھے جن کے صاحب زادے ابوطالب اپنی قوم کی خفگی مول لے کر بعثت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں سینہ سپر اور ان کے ساتھ تعاون میں پیش پیش رہتے تھے[۳۱]۔ ان حقائق سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب بُرا وقت پڑنے پر بزدل اور سراسیمہ ہوجانے والے آدمی نہ تھے، اگر وہ ایسے ہوتے تو قریش کے سردار ہوتے نہ مکہ کے رہنما و رہبر و قائد۔

جہاں تک قریش کا تعلق ہے تو وہ خود عربوں میں اپنی طاقت و شجاعت اور قائدانہ صفات کے لیے مشہور تھے، انھوں نے سرد و گرم کے تجارتی کاروانوں کے ذریعہ عرب قبائل میں اپنے لیے باعزت مقام بنایا تھا، اور ان کے اقتصادی مفادات کے نگراں اور ان کے دینی مقدسات کے محافظ بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ فرزندانِ قریش نے مکہ کی تاریخ میں ہمیشہ تسلّط و غلبہ حاصل کرنے کی بیرونی کوششوں کا توڑ کیا اور انھیں ناکام بنایا، چنانچہ بیزنطیی رومیوں کی مکہ پر تسلّط کی کوشش کی قریش کی طرف سے مخالفت کے بارے میں ابن بکّار لکھتے ہیں:

"جب عثمان بن حویت قیصر کا ایک خط لے کر آیا جس پر سونے کی مہر لگی ہوئی تھی اور اس میں تحریر تھا کہ عثمان مکہ کا بادشاہ اور قیصر کا ماتحت

ہوگا"[۳۲] تو قریش نے اس کو رد کر دیا یہاں تک کہ زمعہ بن اسود ابن مطلب بن اسد طواف میں لوگوں کو لے کر اٹھا اور پکارنے لگا کہ قریش پر کوئی غلبہ و تسلّط حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی بات پر قریش جوش میں آ گئے، انھوں نے عثمان کے مطالبہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کو برا بھلا کہنے لگے یہاں تک کہ اس کو مکہ سے نکال دیا۔[۳۳]

اسی طرح جب ابرہہ نے محمد بن خزاعی کو مکہ پر حاکم بنا کر بھیجا تو بنی کنانہ نے ایک آدمی بھیج کر راستہ ہی میں اس کو قتل کرا دیا۔[۳۴] ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش اور اس کے سربرآوردہ لوگ (جو اس کے حاکم اور مردانِ کار ہوتے تھے) اپنے سیاسی، اقتصادی اور دینی مفادات کے خلاف مصالحت، بھاؤ تاؤ نہیں کرتے تھے، نہ سہل انگاری سے کام لیتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ قریش نے اپنے تمام خاندانوں اور مردانِ کار کے ساتھ اس بیرونی حملہ کے مقابلہ کے لیے امکان بھر پوری تیاری کی تھی اور تمام ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں، چنانچہ ابن اسحٰق نے لکھا ہے:

"ابرہہ کو بیت اللہ ڈھانے سے روکنے کے لیے قریش نے زرہیں اور چیتوں کی کھالیں پہنیں۔[۳۵]

اگر قریش حملہ کے بہادرانہ مقابلہ کے بجائے کسی بزدلی کا اظہار کرتے تو دیگر عرب قبائل کے سامنے ان کی بڑی سبکی ہوتی اور ان کی ہیبت اور رعب داب سب مٹ جاتا۔ پھر چونکہ ابرہہ کے لشکرِ جرار اور ہاتھیوں کے مقابلہ میں قریش کو اپنی کمزوری کا بھی پوری طرح اندازہ تھا اس لیے انھوں نے اس معرکہ کا آخری فیصلہ، ابرہہ کی واپسی، بیت اللہ کی حفاظت وغیرہ درپیش امور کو اللہ کی قدرت و تدبیر کے حوالے بھی کر دیا جو کہ حق والوں کے لیے صحیح طریقہ ہے، یعنی وہ درپیش خطرہ کے ازالہ کے لیے اپنے بس بھر اسباب اختیار کر کے اپنی عاجزی کا کھلا اظہار اللہ سے کرتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان کی حفاظت کرے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کو ناکام و نامراد لوٹانے کے لیے اپنے لشکروں کو اس پر مسلّط کر دیا، اور اہلِ مکہ کو جنگ کی نوبت نہیں آئی، چنانچہ

قرآن شریف میں بھی ذکر ہے:

| | |
|---|---|
| اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ | کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب |
| بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ | نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا |
| كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ | اس نے ان کی تدبیر کو الٹ نہیں دیا؟ |
| عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ | اور ان پر پرندوں کی ٹکڑیاں بھیجیں، |
| بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ | جو ان کو پتھریلی کنکریوں سے مارتی تھیں |
| كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (سورہ فیل) | اور انھوں نے ان کو کھایا ہوا بھس بنا دیا۔ |

اس سورت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر سمندر سے ابابیل کی مانند پرندے بھیجے، ان میں سے ہر ایک کے پاس چنے یا مسور کی دال کے برابر تین پتھر تھے: ایک ان کی چونچ میں اور دو ان کے پیروں میں، جس کو بھی یہ پتھر لگتے تھے وہ مرجاتا تھا۔"[۳۶]

مرنے والوں میں ابرہہ بھی تھا اس لیے کہ اس کے بدن پر بھی پتھر لگا تھا، ابن کثیر نے لکھا ہے:

"باقی ماندہ لوگ ابرہہ کو اپنے ساتھ اس حال میں لے کر واپس ہوئے کہ اس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا، جب وہ صنعا پہنچے تو وہاں ابرہہ مر گیا۔"[۳۷]

عربوں نے جب ابرہہ، اس کے لشکر اور ہاتھیوں کی یہ درگت دیکھی اور قریش نے جس طرح بیت اللہ کا دفاع اور اس کی حفاظت کی، اس کا مشاہدہ کیا تو اس کو بہت بڑا کارنامہ سمجھا اور کہا: آسمان (قدرتِ الٰہی) نے اہل مکہ کی طرف سے جنگ کی، اور اس واقعہ کے طفیل عرب کے دلوں میں قریش کو مزید مقدس مقام حاصل ہو گیا اور انھوں نے قریش کو "اللہ والے اور اس کے گھر کے محافظ" کہنا شروع کر دیا۔[۳۸]

## حاصلِ بحث

اوپر کے بیانات سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ ابن اسحٰق جو سیرتِ نبوی کے پہلے مدوّن ہیں، کی زیرِ بحث روایت مسخ،

تحریف اور بے ربطی سے خالی نہیں، دیگر مرتبینِ سیرت[۳۹]، مورخین[۴۰]، مفسرین[۴۱] اور نئے اہلِ بحث و تحقیق[۴۲] نے اس روایت کو بعینہٖ ابن اسحٰق سے لے لیا، اس کی تحقیق و تنقید کی کوشش کی، نہ اس پر اپنی رائے دی۔

۲۔ اس روایت کے بعض ٹکڑے صحیح ہو سکتے ہیں، لیکن ان اجزاء سے خاص طور پر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جن سے قریش کی عزّت پر حرف آتا ہے، اور وہ ان کو ایسی حالت میں پیش کرتے ہیں جو عرب قبائل میں ان کے معروف مقام و مرتبہ کے خلاف ہیں، اس روایت میں یہ زہر اگرچہ مخفی معلوم ہو لیکن بحث و تحقیق اور تجزیہ سے یہ بالکل واضح معلوم ہونے لگتا ہے، یہ وہی قریش ہیں جن کو ہم دیگر مقامات پر اپنے سیاسی، اقتصادی اور دینی مفادات اور عزّت و حرمت کے لیے جان کی بازی لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں[۴۳] لیکن ابرہہ کے سامنے وہی قریش اور خاص طور سے ان کے اور عربوں کے سردار عبدالمطلب انتہائی ذلّت و مسکنت اور بے بسی و عاجزی، بلکہ ذاتی مطلب پرستی کے عالم میں نظر آتے ہیں، اس لیے اس روایت کی غرض و غایت تمام عربوں اور خاص طور پر ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ پر حرف گیری کرنے کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہوتی، حالانکہ عرب نے ہی سب سے پہلے اسلام کا پرچم اٹھایا، جہاں تک وہ اور ان کے گھوڑوں کے قدم پہنچے اس کو بلند کیے ہوئے آگے بڑھتے گئے، نیز یہ وہ امت ہے جس کو سارے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حنیف کی خدمت کے لیے چنا، جیسا کہ حدیث سے بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ نے کنانہ کو بنی اسماعیل کی اولاد میں سے چنا اور قریش کو کنانہ سے، اور بنو ہاشم کو قریش سے، اور مجھ کو بنو ہاشم میں انتخاب فرمایا"[۴۴]

اس لیے یہی وہ بخت آور امت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی پیغام کی تبلیغ کے شرف سے نوازا۔

۳۔ علم و حقیقت کے طالب علماء و محققین کا فرض بنتا ہے کہ وہ تمام روایات اور ان کی عبارتوں کا احاطہ کر کے ان کی تنقید و تمحیص اور تحلیل و تجزیہ کیا کریں، اس عمل کا مقصد طعن و تشنیع نہیں، بلکہ ہماری باعزت اور نامور امت کی روشن

تاریخ کی خدمت اور اس میں دراندازاسرائیلیات، عیسائیات، مجوسیات، شعوبیات اور دیگر اغراض وخواہشات کے بندوں کی فریب کاری سے اس کی تطہیر وصفائی ہے۔

۴۔ ابرہہ حبشی کے ناجائز ظالمانہ حملہ کے نمایاں نتائج صرف اس کی ناکامی اور نامرادواپسی، پھر اس کی موت ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ تمام عرب قبائل میں مکہ اور قریش کا مقام ومرتبہ مزید بلند ہوا، اور اس کا اثر ان سے وابستہ تمام امراء وحکام وملوک پر بھی پڑا اور مکہ حسب سابق اپنی آزادی وخودمختاری کے ساتھ باقی رہا۔ (سہ ماہی آفاق الثقافۃ والتراث، دبئی، جلد ۱۰، شمارہ ۳۵، اپریل ۲۰۰۲ء صفحات ۶-۱۴)

# حواشی ومراجع

۱۔ السیرۃ، ابن اسحاق، تحقیق محمد حمید اللہ، الرباط ۱۹۷۶، ۱/۳۹

۲۔ الوسیط فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ہاشم یحییٰ الملاح، جامعۃ الموصل ۱۹۹۴ء طبع اول ص ۱۰۳-۱۰۵

۳۔ اخبار مکۃ وما جاء فیہا من الآثار، محمد بن عبداللہ الازرقی، تحقیق رشدی الصالح ملحس، طبع مکہ ۱۹۶۵، طبع دوم، ۱/۱۳۸

۴۔ تاریخ الرسل والملوک، محمد بن جریر الطبری، القاہرہ ۱۹۶۸ء طبع دوم ۲/۱۳۰-۱۳۲

۵۔ تاریخ الرسل والملوک حوالہ سابق

۶۔ الوسیط ص ۱۰۳-۱۰۵

۷۔ اخبار مکہ ۱/۱۳۸، تاریخ الرسل والملوک ۲/۱۳۰-۱۳۲

۸۔ سیرۃ النبی۔ ابن ہشام، تحقیق مصطفیٰ السقا ورفاقہ، بیروت، بدون تاریخ، طبع اول ۱/۴۴-۴۵۔

۹۔ تاریخ الرسل ۲/۱۳۰-۱۳۲

۱۰۔ تاریخ الرسل حوالہ سابق

۱۱۔ الوسیط ص ۱۰۳-۱۰۵

۱۲۔ الوسیط ص ۱۰۵-۱۰۶

۱۳۔ سیرۃ النبی ۱/۴۹

۱۴۔ سیرۃ النبی ۱/۵۰، اخبار مکۃ ۱/۱۴۳

۱۵۔ السیرۃ ۱/۳۹-۴۱۔ اخبار مکۃ ۱/۱۴۳

۱۶۔ السیرۃ حوالہ سابق، اخبار مکہ حوالہ سابق

۱۷؎ السیرۃ حوالہ سابق ، اخبار مکہ ۱/۱۴۵
۱۸؎ اخبار مکہ ۱/۱۰۳-۱۰۵ ۱۹؎ ایضاً ۲۰؎ ایضاً
۲۱؎ تاریخ الرسل والملوک ۲/۱۳۰-۱۳۵ ۲۲؎ سیرۃ النبی ۱/۵۰-۵۲
۲۳؎ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجئے السیرۃ ۱/۳۸-۴۰ سیرۃ النبی ۱/۵۰-۵۵
تاریخ الرسل والملوک ۲/۱۳۰-۱۴۰ ۲۴؎ السیرۃ ۱/۳۹ ، سیرۃ النبی ۱/۵۰
۲۵؎ سیرۃ النبی ۱/۴۵-۴۷ ۲۶؎ سیرۃ النبی حوالہ سابق
۲۷؎ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجئے سیرۃ النبی ۱/۴۵-۴۷
۲۸؎ ہاتھی سے متعلق مزید معلومات کے لیے دیکھئے جامع البیان فی تفسیر القرآن محمد بن جریر طبری ، بیروت ۱۹۷۲ء طبع دوم ، تفسیر ابن کثیر قاہرہ ۱۹۵۴ء طبع سوم ، انوار التنزیل واسرار التاویل بیضاوی قاہرہ بدون تاریخ طبع اول
۲۹؎ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے دیکھئے السیر والمغازی ، محمد بن اسحاق ، تحقیق سہیل زکار دار الفکر ۱۹۷۸ء طبع اول ۱/۲۳-۲۵ - اخبار مکہ ۱/۴۴-۴۹
۳۰؎ ایام العرب فی الجاہلیۃ ، محمد احمد جاد المولی و رفاقہ ، دار الفکر ۱۹۶۱ء ص ۳۲۲-۳۳۲
۳۱؎ السیر والمغازی ۱/۲۳۶-۲۳۸
۳۲؎ جمہرۃ نسب قریش واخبارہا ۔ زبیر بن بکار ، تحقیق محمود محمد شاکر ، دار العروبہ ۱۳۸۱ھ
۳۳؎ جمہرۃ نسب قریش حوالہ سابق ۳۴؎ تاریخ الرسل والملوک ۲/۱۳۰-۱۳۱ ۳۵؎ سیرۃ النبی ۱/۴۶-۵۰
۳۶؎ سورۂ فیل کی مزید تفسیر کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۴/۵۵۲ - ۵۵۶
۳۷؎ سیرۃ النبی ۱/۴۶-۵۰ ، تفسیر ابن کثیر ۴/۵۵۲-۵۵۶ ۳۸؎ اخبار مکہ ۱/۱۴۸
۳۹؎ سیرۃ النبی ۱/۴۶-۵۰ الطبقات الکبریٰ ۲/۳۲-۴۰
۴۰؎ الکامل فی التاریخ ، ابن اثیر ، بیروت ۱۹۶۵ ، طبع اول ۲/۸۰-۸۵
۴۱؎ سورۂ فیل کی تفسیر کے لیے ملاحظہ کیجئے الجامع لاحکام القرآن قرطبی اور انوار التنزیل بیضاوی
۴۲؎ محاضرات فی تاریخ العرب ، صالح احمد العلی ، جامعۃ الموصل ۱۹۸۱ء طبع اول ص ۳۰
۴۳؎ ملاحظہ کیجئے بنو مخزوم ودورہم السیاسی والحضری حتی نہایۃ العہد الراشدی ، ریاض ہاشم نعیمی (غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی تھیسس) کلیۃ الآداب ۔ جامعۃ الموصل ۱۹۹۶ء
۴۴؎ صحیح مسلم ، تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی قاہرہ ۱۹۵۵ء طبع اول ۷/۵۸

## تعارف وتبصرہ

# قرآن اور قانونِ نکاح وطلاق

جناب سید امین الحسن رضوی

قیمت مجلد =/۴۵ صفحات ، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱ حوض ہوڈلان نئی دہلی ۲

دین وملت کے ایک بہترین خادم محترم جناب سید امین الحسن رضوی کا سال رواں میں ۵ فروری ۲۰۰۳ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ایک سنیر صحافی اور اچھے قانون داں تھے۔ دستورِ ہند اور مسلم پرسنل لا پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے۔ وہ پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کے طویل عرصہ تک رکن رہے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل خاص طور پر قانونی مسائل سے ہمیشہ دلچسپی لیتے اور اس سلسلے میں جو اعتراضات یا سوالات ابھرتے ان کا بس بھر جواب دینے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو بھی متوجہ کرتے تھے۔ جماعت اسلامی ہند اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے تعلق خاطر تھا۔ ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ کے تاسیسی رکن تھے۔ اس کی نشستوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور اس کے مسائل سے خاص دلچسپی لیتے۔ اس عاجز سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ میں خود بھی بہت قرب محسوس کرتا تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی کسی نہ کسی دینی وعلمی موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ امین الحسن رضوی صاحب انگریزی اور اردو میں مختلف موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل ان کی کتاب 'قرآن اور قانونِ نکاح وطلاق' شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے نکاح، مہر، حقِ زوجیت، طلاق، متاعِ طلاق، عدت، خلع، ایلاء، لعان، ظہار اور مطلقہ کے حقوق جیسے مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے اور بعض قانونی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی بعض فروگزاشتوں پر ان کے برادر عزیز جناب خورشید حسن رضوی صاحب نے انھیں اپنے ایک خط میں توجہ دلائی تھی۔ یہی خط بطورِ تبصرہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ (جلال الدین)

صفحہ ۱۸: آپ نے لکھا ہے "عورت کو بھی اپنے طور پر نکاح کو ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اسے خلع کہتے ہیں"۔

یہ عبارت غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے۔ اس معاملہ میں عورت کا ملاً خود مختار نہیں ہے۔ پہلے تو اسے شوہر سے Negotiate کرنا ہوتا ہے۔ اگر معاملہ طے نہ ہو سکے تو قاضی (عدالت) کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔

صفحہ ۱۹: تشریح میں یہ عبارت آئی ہے "(۳) عورتوں کے حقوق مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر...."

اس عبارت سے عورتوں اور مردوں کی مساوات اور ان کے آپسی حقوق کی یکسانیت کا مفہوم متبادر ہوتا ہے یعنی جیسا حق مرد کو عورت پر ہے ویسا ہی حق عورت کو مرد پر حاصل ہے یہ بالکل غلط ہے۔ دراصل مولانا تھانویؒ کا ترجمہ ہی کچھ گنجلک ہو گیا ہے۔ آیت کے اس جزو کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا "ان (عورتوں) کے لیے اس کے مثل ہے جو ان پر ہے"۔ یعنی ان عورتوں کے جو حقوق ہیں وہ ان فرائض سے مطابقت رکھتے ہیں جو ان پر عائد ہوتے ہیں گویا بات توازن کی ہے نہ کہ مساوات کی۔ کتاب کے صفحہ ۲۲ پر آپ نے سورہ النساء کی آیت ۳۴ نقل کی ہے۔ اسی پر ایک نظر ڈال لیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ بیوی کے لیے لازم ہے کہ قانتہ اور حافظۃ للغیب ہو۔ کیا مرد کے لیے بھی یہی لازم ہے پھر مرد کو اپنی بیوی کی تادیب کا اختیار دیا گیا ہے۔ کیا بیوی کو بھی یہ حق حاصل ہے؟ سید قطب مرحوم کے Feminism سے مرعوب ہونے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دورِ جدید کے اکثر اسلام پسند بلکہ فدائی بھی مغرب گزیدگی سے کلیتاً محفوظ نہیں رہ سکے ہیں اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔

صفحہ ۲۲: "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ" میں ایک فطری قانون بیان کیا گیا ہے جس کا اطلاق اس آیت کے سیاق میں شوہر اور بیوی پر ہوتا ہے۔ یہ قانون اپنے اندر ایک ایسا عموم رکھتا ہے جس کی تحدید اس آیت کے سیاق و سباق کے ذریعہ درست نہیں۔ اگر قوامیت کو صرف شوہر اور بیوی کے درمیان ہی محدود کرنا مقصود ہوتا تو آیت کے الفاظ یہ ہوتے "الرجال قوامون علی

نساءھم" آپ اور آپ کے ہم خیال لوگوں کے ذمہ میرے جیسے جاہلوں کا یہ قرض ہے کہ آپ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے "نساءھم" کے بجائے "النساء" کا لفظ آخر کیوں استعمال کیا ہے یا پھر بیویوں کے لیے جو دوسرے عربی الفاظ خود آپ نے تحریر کیے ہیں کیوں استعمال نہیں کیے گئے ؟

صفحہ ۲۴: بیوی کے لیے لفظ "حلیہ" لکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ صحیح لفظ "حلیلہ" ہے جس کی جمع "حلائل" قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔

ایک آیت کے الفاظ "للذین یولون"... غلط چھپ گئے ہیں۔ "نساءکم" کے بجائے "نساءھم" ہونا چاہیے۔

## لونڈیوں سے جنسی تعلق

یہ مسئلہ جن آیات میں زیر بحث آیا ہے وہ صفحات ۱۳، ۱۴، ۲۵، ۲۹، اور ۳۶ پر نقل کی گئی ہیں۔ اس بحث میں بار بار لونڈیوں سے نکاح کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی صراحت ہے کہ ان سے بغیر نکاح کے بھی جنسی تعلق جائز ہے۔ لیکن یہ بحث اتنی منتشر اور گنجلک ہوگئی ہے کہ مسئلہ کی صحیح صورت واضح نہیں ہوسکی۔

لونڈی کے جنسی استفادہ کی دو شکلیں ہیں (۱) لونڈی کا مالک خود استفادہ کرے (۲) استفادہ کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہو جو لونڈی کا مالک نہیں ہے۔

پہلی صورت میں نکاح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ مالک کسی وجہ سے اسے آزاد کرنا چاہے۔ (جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ کے ساتھ کیا۔ حضرت صفیہؓ کے ساتھ نکاح اس طرح ہوا کہ ان کی آزادی کو ان کا مہر قرار دیا گیا اور حضرت جویریہؓ کا زرِ مکاتبت بطور مہر ادا کیا گیا۔ ان دونوں صورتوں میں سیاسی مصلحتیں پیش نظر تھیں) لونڈی جب تک لونڈی ہے، مالک سے اس کا نکاح نہیں ہوتا۔ مالک اس سے استفادہ کرسکتا ہے خواہ اس کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ چار کے عدد کی پابندی بھی اس میں نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ کہ کوئی ایسا شخص استفادہ کرنا چاہے جو لونڈی کا مالک نہیں ہے۔ ایسے شخص کو لونڈی کے مالک کی اجازت سے نکاح کرنا ضروری ہے۔ اسی کا ذکر اس آیت میں ہے جو صفحہ ۲۹ پر آپ نے نقل کی ہے۔ قرآن میں یہ واحد آیت

ہے جس میں اس کا ذکر ہے۔ اس میں کئی طرح کی پابندیاں ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کو چھوڑ کر دیگر ائمہ کے نزدیک صرف مومنہ باندیوں سے ہی نکاح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اہلِ کتاب باندی سے بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر مکروہ ہے۔

اگر کوئی غیر شادی شدہ شخص آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت رکھتا ہے تو اس کے لیے باندی سے نکاح ناجائز ہے۔ صرف امام ابوحنیفہؒ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ جس شخص کی ایک یا زائد آزاد بیویاں موجود ہوں اس کے لیے باندی سے نکاح سب کے نزدیک حرام ہے۔

آپ نے صفحہ ۲۹ پر سورہ النساء کی آیت ۲۵ کی تشریح کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے کہ "اسلام لونڈی سے بغیر نکاح کے بھی جنسی تعلق قائم کرنے (تمتع) کی اجازت دیتا ہے" بے محل ہے اس لیے کہ یہ اجازت صرف مالک کو اپنی لونڈی کے بارے میں ہے اور یہ آیت اس سے متعلق نہیں ہے۔

صفحہ ۳۰ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۱ میں مومنین اور مشرکین کے درمیان رشتۂ مناکحت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تشریح میں دو رائیں ہیں۔ ایک تو وہی ہے جسے آپ نے بیان کیا ہے یعنی یہ ممانعت اصلاً تمام غیر مسلمین کو محیط ہے لیکن آگے سورہ المائدہ کی آیت ۵ میں اہلِ کتاب کی عورتوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس آیت میں صرف مشرکین سے نکاح کی حرمت آئی ہے اور اہلِ کتاب اس میں شامل ہی نہیں ہیں لہٰذا استثناء کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سورہ المائدہ میں جو اہلِ کتاب کی عورتوں کو حلال قرار دیا گیا ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مرد حلال نہیں ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے سورہ النساء میں مردوں کو چار شادیوں تک کی اجازت دی گئی اور اس سے یہ مسئلہ نکلا کہ اس سے زیادہ حرام ہے۔

میرا رجحان دوسری رائے کی طرف ہے اس لیے کہ قرآن میں اہلِ کتاب کو کہیں بھی "مشرک" یا "کافر" کہہ کر نہیں پکارا گیا ہے باوجود یہ کہ ان کے بعض عقائد و اعمال پر کفر و شرک کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس آیت میں چونکہ "لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ"

اور "لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ" کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے قرینہ اسی بات کا ہے کہ اس میں اہلِ کتاب شامل نہیں ہیں۔ اس آیت کی شانِ نزول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، مزید کہ اگر یہ تاویل اختیار کی جائے تو اس میں سورہ المائدہ کی آیت ۵ کے ذریعہ نسخ ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔

صفحہ ۵۰ سورہ الطلاق آیت ۲: اس آیت میں طلاق سے رجوع کے لیے دو عادل گواہ بنانے کا ذکر ہے۔ تشریح میں آپ نے لکھا ہے "مفسرین اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ کوئی قانونی شرط نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ترغیبی ہے نہ کہ تحکیمی"؛ لفظ "تحکیمی" یہاں غلط استعمال ہوا ہے۔ تحکیم، ثالثی Arbitration کو کہتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت ترغیب کی ہے حکم کی نہیں۔ دوسرے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس پر مفسرین اور علماء کا اتفاق ہے۔ فقہاءِ اہلِ سنت میں سے "جمہور" کی یہ رائے بیان کی گئی ہے جس کا درجہ اجماع سے بہت کم ہے اور ان کے نزدیک بھی بہتر یہی ہے کہ گواہ مقرر کر لیے جائیں۔ شیعوں کے نزدیک بغیر گواہوں کے نہ تو طلاق ہوتی ہے نہ رجوع۔ اہلِ سنت کے مآخذ (ابوداؤد، سیوطی اور عبدالرزاق) بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے حضرت علیؓ اور عمران بن حصینؓ اور تابعین میں سے امام محمد الباقرؒ، امام جعفر الصادقؒ، عطاء ابن ابی رباحؒ اور ابن سریجؒ کا یہی مسلک تھا۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں جس انداز سے اس کو بیان کیا ہے اس سے ان کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاید حنفی ماحول کے جبر کی وجہ سے کھل کر نہیں لکھ سکے۔

صفحہ ۵۴ آیت کی کتابت میں غلطی ہو گئی ہے۔ "ان اردتم" چھپ گیا ہے "ان اردتم" ہونا چاہیے۔

میرے خیال میں اس آیت کے اطلاق میں غور و فکر کی گنجائش ہے۔ زمانہ اور عرف کا لحاظ کرنا مناسب ہے۔ کتنے ہی گھرانوں میں یہ رواج ہوتا ہے کہ خاندانی زیور شادی کے وقت ایک بہو کو چڑھایا جاتا ہے۔ جب دوسری بہو آنے والی ہوتی ہے تو وہ پہلی سے واپس لے کر دوسری کو چڑھا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح آڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے جمع پونجی عورتوں کے زیور کی شکل میں محفوظ کی جاتی ہے۔

اسے عورتیں استعمال بھی کرتی ہیں لیکن اس کی اصل حیثیت محفوظ دولت کی ہوتی ہے۔ کچھ غیر منقولہ جائداد بھی قانونی مجبوریوں کے تحت عورتوں کے نام کردی جاتی ہے جو "بے نامی" ہوتی ہے۔ ان سب امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

صفحہ ۵۵ سورۂ بقرہ آیت ۲۳۲: آپ نے اس آیت کے ترجمہ پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ شانِ نزول کے لحاظ سے یہ ترجمہ بالکل صحیح ہے۔ حضرت معقل ابن یسارؓ ایک صحابی تھے۔ ان کی بہن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی، پھر عدت بھی گزر گئی۔ اب ان کے لیے پیامات آنے لگے تو ان کے سابق شوہر نے بھی پیام دے دیا۔ حضرت معقلؓ ان سے طلاق کے سبب سے ناراض تھے اور اس وجہ سے اس رشتہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ یہی قضیہ اس آیت کی شانِ نزول بیان کیا جاتا ہے ورنہ جس معاشرہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس میں بیوہ یا مطلقہ کا عقدِ ثانی یا ثالث وغیرہ نہ اس دور میں کوئی مسئلہ تھا نہ آج ہے۔ مولانا محمود الحسنؒ نے تو آیت کے الفاظ کا ترجمہ ہی "اپنے انہی شوہروں سے" کیا ہے اس لیے کہ آیت کے الفاظ ہیں "ان ینکحن ازواجھن" اگر الفاظ یہ ہوتے "ان ینکحن من یشئن"، تب تو آپ کا اخذ کردہ مفہوم درست ہوتا۔

صفحہ ۶۸ لعان

اس مسئلہ پر آپ کی نسائیت پرستی (Feminism) نے بڑی ناگوار صورت حال پیدا کردی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے اس کا ازالہ کس طرح ممکن ہے جبکہ آپ کی کتاب چھپ کر بازار میں آبھی چکی ہے۔

آپ نے لکھا ہے "اس آیت میں اس صورت حال کا احاطہ کیا گیا ہے کہ صرف شوہر نے اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ یا صرف بیوی نے اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کے ساتھ محوِ اختلاط دیکھا ہو اور دونوں کے پاس کوئی اور گواہ نہ ہو۔"

یہ بالکل غلط ہے۔ لعان کی مشروعیت صرف اور صرف مرد کے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے کی صورت میں ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ اس فعل میں مشغول دیکھا ہو۔

دوسری یہ کہ مرد اپنی بیوی کے حمل یا اس کے بچہ کو اپنا ماننے سے انکار کر دے پہلی شکل میں گواہ نہ ہونے کے باوجود مرد کی غیرت کی رعایت رکھی گئی ہے، دوسری شکل میں بچہ کے نسب کا معاملہ اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں ہی باتیں عورتوں کی طرف سے الزام زنا کی صورت میں غیر متعلق ہیں۔ عورت یا تو چار گواہ لائے، یا خاموش رہے ورنہ کوڑے کھائے گی۔ یہ مسئلہ نہایت ہی واضح ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۷ سورہ الطلاق آیت ۶:

مطلقہ ماں اگر بچہ کو دودھ پلائے تو اس کے اجر کے تعلق سے بات اس طرح آئی ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ کے نزدیک دورانِ عدت بھی نفقہ کے علاوہ اجرِ رضاعت بچہ کے باپ پر ہے۔ حالانکہ مسئلہ ایسا نہیں ہے۔ ماں اگر دودھ پلا رہی ہو تو نفقۂ عدت اور اجرِ رضاعت ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے۔ (خورشید حسن رضوی)


ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی ایک اہم پیشکش

## مذہب کا اسلامی تصوّر

مولانا سلطان احمد اصلاحی

اس کتاب میں معاملاتِ دنیا سے مذہب کی بے دخلی کے تصور کو اس کے خاص تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چرچ کے ناقابلِ بیان مظالم کے نتیجے میں یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی اور مسیحیت سے بے زاری کے ساتھ خود مذہب سے بے زاری پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرے باب میں قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلام کے مطلوبہ تصورِ مذہب کو پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آفسٹ کی عمدہ طباعت صفحات ۵۹۱۔ قیمت مجلد صرف ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ابوالفضل انکلیو۔ نئی دہلی ۲۵